اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مرتب	قیمت فی پرچہ
سالانہ چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) " غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ	محمد یونس	آٹھ آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۶	جون سنہ ۱۹۵۰ء	جلد ۳

فہرست مضامین

تمام شہر ہے، دو چار دس کی بات نہیں	۱	ریڈ کراس (نظم)	۴۰
لمعات	۳ - ۷	(اسد ملتانی صاحب)	
مہاجرین کا مسئلہ	۸ - ۱۳	باب المراسلات	۴۱ - ۵۰
رفتارِ عالم	۱۴ - ۲۴	(پرویز صاحب)	
بقیہ رفتارِ عالم	۳۹	کیا حدیث قرآن کی تفسیر کیلئے ضروری ہے؟	۵۱ - ۷۶
اسلام اور سائنس	۲۵ - ۳۸	(ابو المنظر صاحب)	
(نذر الباقر صاحب)		اشتہارات	۷۷ - ۸۰

تمام شہر ہی دو چار دس کی بات نہیں!

میں نے حسبِ معمول رکشا والے سے باتیں شروع کیں۔ میں نے پوچھا "کہو بھائی، گزارہ ہو جاتا ہے؟" اس نے کہا: "اگر کوئی چار سو بیس کرنے والا نہ مل جائے تو گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔" میں نے کہا: "تم سے چار سو بیس والوں کا کیا واسطہ؟" اس نے کہا: "ہر روز واسطہ پڑتا ہے، بابو جی! ابھی پرسوں رات کا ذکر ہے، ایک بجے کے قریب صدر میں تین سواریاں جناح ہسپتال کیلئے کھڑی ملیں۔ دو سواریاں بٹھانے کا حکم ہے۔ میں نے کہا اس وقت کون دیکھتا ہے، تینوں کو لا دلو۔ ابھی سندھ دفتر کے پاس پہنچا تھا کہ ایک کھمبے کے پیچھے سے سنتری نکل آیا اور اس نے مجھے روک لیا۔ بھلا پوچھئے کہ رات کے ایک بجے اس کا کام پہرہ دینا تھا، یا رکشا والے کو روکنا۔ اسے چونی دی اور پیچھا چھڑایا۔ جناح ہسپتال پر سواریاں اتاریں تو ان سے نقد روپیہ وصول کیا۔ صبح اُٹھ کے جو دیکھتا ہوں تو روپیہ کھوٹا ہے۔ نہ اسے مقناطیس لگے، نہ کوئی دکاندار قبول کرے۔ میں نے کہا دنیا کتنی بے ایمان ہے۔ دن بھر روپے کو لئے لئے پھرا، اسے نہ چلنا تھا، نہ چلا۔ شام کو نازسینما میں "دنیا" کا کھیل لگ رہا تھا۔ وہاں گیا، دیکھا تو ایک مکرانی چھ آنے کا ٹکٹ روپے میں بلیک کر رہا تھا۔ رش زوروں کا تھا، میں نے جھٹ سے روپیہ اس کی مٹھی میں تھمایا اور مکرانی سے ٹکٹ لیکر اندر چلا گیا۔ باہر نکلتے وقت مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بے ایمان مکرانی تاک میں نہ بیٹھا ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے روپیہ دیکھا نہیں۔

——— یوں مل جاتے ہیں بابو جی، چار سو بیس کرنے والے۔"

سوچئے کہ چار سو بیس کون کون ہے؟ رکشا والے نے چھ آنے کی بجائے ایک روپیہ کرایہ مانگا اور دو کی بجائے تین سواریاں بٹھائیں۔

سپاہی نے چونی وصول کی۔

سواریوں نے کھوٹا روپیہ تھمایا۔

مکرانی نے سینما کے ٹکٹ میں بلیک کیا۔

اور رکشا والے نے وہ روپیہ مکرانی کو تھما دیا!

رکشا والے کی داستان یہیں ختم ہو گئی، ورنہ اگر سلسلہ آگے بھی چلتا تو نہ معلوم اس کی مزید کڑیاں کہاں کہاں سامنے آتیں۔

اور یہی کہانی کے کرداروں میں سے ہر شخص اپنی جگہ مطمئن کہ میں نے خوب کیا!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

سفاکی اور خونریزی درندوں کی دنیا کا مسلک اور قتل و غارت گری ڈاکوؤں کے نظام کا مشرب ہے۔ صلح و آشتی انسانیت کا تقاضا ہے اور امن و سلامتی شرطِ آدمیت ہے۔ اسلام جو دنیا میں معراجِ انسانیت کے قیام کا بلند نصب العین اپنے سامنے رکھتا ہے انسانی زندگی کی قیمت کو اتنا گراں بہا قرار دیتا ہے کہ اس کا کھلا فیصلہ ہے کہ جس نے کسی ایک زندگی کو ناحق تلف کر دیا یوں سمجھئے کہ اس نے پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا؛ اور جس نے کسی ایک جان کو بچا لیا اس نے ساری انسانیت کا تحفظ کر لیا۔ علاوہ اس کے یہ عدیم النظیر تعلیم وحدتِ انسانیت کے ابدی اصول کی آئینہ دار ہے جو دنیا میں امن و سلامتی کے قیام کی بھی اسی درجہ ضامن ہے۔ لہٰذا ہر وہ قدم جو دنیا میں امن و سلامتی کے قیام کے لئے اٹھایا جائے ہر مسلمان کیلئے درخورِ ہزار تہنیت۔ ہر وہ تحریک جو فساد و خونریزی کے استیصال کے لئے وجود کوش ہو ہر مومن کے نزدیک لائقِ صد مبارکباد۔ مسلمان ہر ایسے اقدام کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے گا اور ہر ایسی تحریک سے تعاون میں فخر و سعادت محسوس کرے گا۔ تقسیمِ ہند سے اس وقت ملک کو جن فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کے جاں گداز اور دلسوز مراحل سے گزرنا پڑا کون سا قلبِ حساس ہے جو ان سے متاثر نہ ہوا ہوگا اور کونسی آنکھ ہے جس نے اس پر خوں فشانی نہ کی ہوگی۔ ان حالات کے ماتحت پاکستان اور بھارت کا حالیہ معاہدہ جس کی رو سے ان دونوں ممالک نے اپنی اپنی حدودِ مملکت میں اقلیتوں کے تحفظ کی ذمہ داری کے فریضہ کو دہرایا ہے، ہر قلبِ مضطرب کے لئے باعثِ صد اطمینان ہے اور موجبِ ہزار سکون۔ کیا اچھا ہوتا اگر اقلیتوں کے تحفظ کا یہ احساس آج سے تین سال پہلے بیدار ہو جاتا! خدا کرے کہ اس معاہدہ کو قلبی توثیق حاصل ہو اور جتنا یہ معاہدہ اپنے الفاظ میں خوش آئند ہے اس سے بڑھ کر اپنے مظاہرے میں جنت نگاہ بن جائے۔

اس کے باوجود اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ معاہدات محض مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں کے زور پر کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ معاہدوں کی کامیابی کا راز اس سے کہیں گہرا ہوتا ہے۔ جو معاہدات محض ہنگامی جذبات پر مبنی ہوتے ہیں وہ کبھی دیرپا نہیں ہوا کرتے۔ کامیاب و کامران وہی معاہدے ہوتے ہیں جن میں حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کیا گیا ہو اور خطاؤں کا نہایت کشادہ ظرفی سے اعتراف۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر فریق یہی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو معصوم ٹھہرائے اور فریقِ ثانی کو

موردِ الزام قرار دے۔ اس بنا پر اگر ہم یہ کہیں کہ اس تین برس کے حقائق کا تجزیہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ پاکستان کی طرف سے کسی مقام اور کسی راہ میں بھی دراز دستی نہیں ہوئی اور اس کے برعکس جو کچھ ہمارے ہمسایہ ملک کی طرف سے عمل میں آتا رہا اس کے تصور سے انسانیت کی نگاہ جھک جاتی ہے۔ تو کہہ دیا جائے گا کہ یہ اسی جنبہ داری کا نتیجہ ہے، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، لیکن واقعات کو کسی غیر جانبدار کے سامنے رکھ دیجئے اور پھر اس سے پوچھئے کہ اس کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ واقعات کی ان تفاصیل کو دہرا کر پائل بہ سکون فضا میں ارتعاش پیدا کیا جائے، لیکن جی چاہتا تھا کہ مملکتِ بھارت کے نمائندے کشادہ ظرفی سے اس کا اعتراف کرتے کہ ان کے ملک کی طرف سے بڑی زیادتیاں ہوئیں جس کا انہیں شدید احساس ہے اور جس کی تلافی میں آئندہ مسلمانوں کے تحفظ کا حتمی طور پر ذمہ لیتے، لیکن ان کی طرف سے ایسا نہیں ہوا اور پاکستان اور بھارت دونوں ایک ہی سطح پر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے کر دیئے گئے۔ یہ واقعات کا مقابلہ اور حقائق کا اعتراف نہیں۔ بایں ہمہ ہم اس مقصدِ عظیم کے حصول کی غرض سے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس ناانصافی کو بھی قبول کر لینے پر آمادہ ہیں۔ اگر پاکستان کچھ بے جا تہمتیں بھی اپنے سر دھر لینے پر ہندوستان کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کی جان اور آبرو کی حفاظت کا ذریعہ بن سکتا ہے تو یہ سودا اس قیمت میں گراں نہیں ہے۔ ہمارے احساسات کی لاکھوں نزاکتیں ہندوستان کے مسلمان کے ایک قطرۂ خون پر نچھاور کی جا سکتی ہیں۔

لیکن جس بات کیلئے ہم نے اس سلسلہ کو چھیڑا ہے وہ اس سے ابھی گہری ہے۔ مسلمان من حیث القوم بڑا جذباتی واقع ہوا ہے۔ اور جب کوئی اس کے جذبات کو اپیل کرتا ہے تو یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنا سب کچھ اس پر نثار کر دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی شدت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اس باب میں اپنی تمام حدود تک کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ تحریکِ خلافت کے دنوں کو یاد کیجئے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ہاتھوں سے پانی لے کر پی لیا تو اس قوم نے سوامی شردھانند کو جامع مسجد دہلی کے منبر پر لا بٹھایا۔ لیکن جو اتحاد محض ان جذبات پر مبنی تھا اس کا کیا نتیجہ نکلا، اس سے کوئی شخص بے خبر نہیں۔ جذبات کے اس طوفان اور تلاطم میں قائداعظم مرحوم کی پہلی آواز تھی جس نے جذبات سے ہٹ کر ٹھوس واقعات کی بنیادوں پر ہندو مسلم اتحاد کی عمارت کو استوار کرنے کی طرف دعوت دی، اور وہ دعوت یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں — مختلف تصوراتِ زندگی کی حامل اور متضاد فلسفۂ حیات کی علمبردار۔ ان میں صحیح اتحاد کی یہی صورت ہے کہ انہیں دو مستقل قومیں تصور کر کے ان کی الگ الگ حکومتیں قائم کر دی جائیں اور ان دو حکومتوں میں نہایت صاف دلی سے دوستی کے معاہدے استوار ہو جائیں۔ ہندوؤں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی یا انہوں نے اسے سمجھنا نہ چاہا، اور اس کا نتیجہ گذشتہ تین سال کی درندگی اور بہیمیت کا کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اب جبکہ ہندوستان نے محسوس کیا ہے کہ ان

دونوں ممالک کے اتحاد کے بغیر زندگی کی کوئی ممکن صورت نہیں۔ ہم اپنے محترم قائداعظم مرحوم کی ہم آہنگی میں ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ اتحاد اسی صورت میں پائیدار ہو سکتا ہے جب اس حقیقت کو واضح طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور ان میں قدرِ مشترک ان کی ہمسائگی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ باہمی اتحاد کے اس جدید اعلان کے ساتھ ہی انہی سطحی جذبات کا پھر مظاہرہ ہونا شروع ہو گیا ہے جو اس سے پہلے کئی مرتبہ اتحاد کی کوششوں کو ناکام بنا چکے ہیں۔ ایک طرف یہ صورت ہے کہ مسلمان صحافیوں کا ایک وفد خیر سگالی ہندوستان جاتا ہے اور اس مقصد کی اہمیت کے پیشِ نظر حکومت پاکستان کے وزیرِ داخلہ خواجہ شہاب الدین صاحب ان کے ہمراہ جاتے ہیں۔ یہ اقدام بڑا مستحسن تھا۔ لیکن جذباتی مسلمان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہاں پہنچ کر یہ اس قسم کی تقریریں شروع کر دیتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر ایک ہے، ان کے نظریاتِ زندگی میں کوئی تفاوت نہیں اور یہاں تک بھی کہ مسلم لیگ کی قسم کی "فرقہ دارانہ" جماعتوں سے انہیں کبھی سروکار نہیں رہا کیونکہ شاید وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بعد اور مغائرت کی ذمہ دار ہیں۔ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے! یہ وہی جذبات فروشیاں ہیں جو اس سے پیشتر نہ صرف یہ کہ ہمیں دوسروں کی نگاہوں میں تملق پیشگی کی خفت کا پیکر بنا چکی ہیں بلکہ حقائق سے آنکھیں چرا لینے کی وجہ سے باہمی اتحاد کی کوششوں کو بھی نامراد کر چکی ہیں۔

دوسری طرف بھارت کے اربابِ حل و عقد کی طرف سے بعض ایسی باتیں زبان تک آ گئی ہیں جو نگاہِ بصیرت کو اندیشہ ہائے دور و دراز کی طرف منعطف کرتی ہیں۔ اس باب میں محترم جواہر لال نہرو کی وہ تقریر خاص طور پر توجہ طلب ہے جو انہوں نے ان صحافیوں کے وفد کے سامنے دہلی میں ارشاد فرمائی تھی۔ جستہ جستہ اقتباس یہ ہیں:

> ہمارے لئے ترقی کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ ہمیں باہمی تنازعات سے اپنی ہوا نہیں اکھیڑنی چاہئے، بلکہ اپنے ذرائع کو مجتمع کر کے خارجی اور داخلی امور میں ایک دوسرے کا پورا پورا ساتھ دینا چاہئے۔
>
> یہ صحیح ہے کہ پاکستان اور ہندوستان اس حد تک ایک دوسرے سے وابستہ ہیں کہ معمولاً انہیں ایک دوسرے سے بدرجہ غایت تعاون کرنا چاہئے۔ انہیں خارجی امور میں مشترکہ پالیسی اختیار کرنی چاہئے اور امکانی طور پر دفاعی معاملات اور معاشی امور میں بھی۔ . . .
>
> آزاد ممالک مشترکہ پالیسی اختیار کر لیں تو وہ ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ یہی قدرتی راہ ہونی چاہئے مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی مصیبت نہ آ پڑی تو (ہمارے لئے) یہی قدرتی راہ ہو گی۔
>
> یہ بدیہی امر ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کو صرف دوست ہی نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ایسے ممالک جو سب گہرے دوست ممالک کے مقابلہ میں بھی زیادہ گہرے دوست ہوں۔ یہ کیسے ہو سکے گا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ . . .

میں تو اس نتیجہ پر پہنچ گیا ہوں کہ اگرچہ ہم منقسم اور ایک دوسرے سے منقطع ہو گئے ہیں، تاہم ہمارے "تاریخی، ثقافتی، معاشی اور جغرافیائی روابط" اتنے اساسی طور پر مضبوط ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جس قسم کے جذباتِ نفرت اور قتل و غارت گری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اس کے باوجود یہ سیاسی محرک باقی رہیگا اور تمام امور پر غلبہ حاصل کر لیگا۔

یہ ظاہر ہے کہ زیرِ نظر معاہدہ اقلیتوں کے تحفظ کے متعلق تھا اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاہدہ کو دونوں ممالک کی خارجی پالیسی اور مشترکہ دفاع سے کیا تعلق ہے؟ خارجی پالیسی اور مشترکہ دفاع وہ امور تھے جن کی بنا پر ہندوستان ایک مرکزی حکومت قائم کرنے کا دعوے دار تھا اور یہی وہ بنیادی امور تھے جو مسلمانوں کے لئے کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہ تھے۔ اگر خارجی پالیسی اور دفاع (اور دفاع کے لئے مواصلات) میں اشتراک قابلِ قبول ہوتا تو پاکستان کی جداگانہ حکومت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ضد کے طور پر اپنی خارجی پالیسی بھارت کی خارجی پالیسی کے خلاف رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ایک آزاد ملک اپنی خارجی پالیسی کے تعین میں قاطبۃً آزاد اور مختار ہوتا ہے۔ اقلیتوں کے تحفظ کے مسئلہ کو ان سوالات سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر فرض کیجئے کہ پاکستان اپنی خارجی پالیسی کو بھارت کی خارجی پالیسی کے متضاد سمت میں متعین کرلے تو کیا اس صورت میں بھارت وہاں کی مسلم اقلیت کو اس جرم کی پاداش میں کہ پاکستان نے ایک جداگانہ خارجی پالیسی کیوں متعین کی ہے، پھر سے ذبح کرنا شروع کر دیگی؟ اگر بھارت کے اربابِ سیاست کے نزدیک اقلیتوں کے تحفظ کا معاہدہ اس قسم کی شرائط سے مشروط ہے تو انھیں سن رکھنا چاہئے کہ یہ معاہدہ کم از کم پاکستان کے نمائندوں سے تو طے نہیں ہوا۔ ہمیں حیرت ہے کہ ان اہم معاملات میں حکومتِ پاکستان نے اس وقت تک کیوں خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ انھیں چاہئے تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے نہایت متانت اور وضاحت سے کہہ دیتی کہ اقلیتوں کی حفاظت کے معاہدہ کو انہی حدود تک رکھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ پنڈت نہرو کی اس تقریر کو معصوم سا سمجھ لیا گیا ہو اور اس لئے اس کا نوٹس نہ لیا گیا ہو، لیکن بھارت کی مملکت کا وزیرِ اعظم کوئی ایسا غیر ذمہ دار شخص نہیں ہے کہ اس کے اس قسم کے الفاظ کو محض شاعری سمجھ کر ٹال دیا جائے۔ کیا کہیں یہی تو وجہ نہیں کہ بھارت کے وہ سیاسی عناصر (مثلاً جے پرکاش نرائن وغیرہ) جو اس تین برس میں کسی ایک دن بھی یہ کہنے سے نہیں چوکے کہ ہمیں ہندوستان اور پاکستان کو پھر سے ایک ملک بنانا ہے، وہ آج کل بالکل خاموش ہیں؟

ہم نے ان گزارشات کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے الفاظ میں "مسلمان ہمیشہ جنگ میں جیتتا ہے اور صلح میں ہارتا ہے"! ہم نے بھارت سے صلح کی ہے اور دل کی پوری صفائی کے ساتھ کی ہے۔ ہم اس معاہدہ صلح کے ایفا میں پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں کے جان، مال، آبرو سب کا تحفظ کریں گے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر یہ معاہدہ

نہیں ہوا ہوتا تو ہم تب بھی ایسا ہی کرتے کہ ہم ایسا کرنے پر اپنے خدا کی طرف سے مامور ہیں۔ لیکن ہم قدرتی طور پر بھارت کے باسیوں سے بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ بھی اپنی مظلوم مسلم اقلیت کا اسی طرح سے تحفظ کریں اور اس معاہدہ کو انہی خطوط تک محدود رکھیں جن پر اسے وضع کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم اپنے جذبات میں بہ جانے والے مسلمان بھائیوں سے بھی یہ گزارش کریں گے کہ وہ جذباتِ سیاس گزاری کے انجام میں تملق پیشگی تک نہ اتر آیا کریں۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ جو نتائج حقائق کا اظہار پیدا کرتا ہے وہ جذبات کا تموج پیدا نہیں کیا کرتا۔ قومیں حقائق کے سہارے زندہ رہا کرتی ہیں، سطحی جذبات کی نمائشوں سے نہیں۔ اگر کوئی دوسری قوم حقیقتوں کو بے نقاب دیکھنا گوارا نہیں کرتی تو ایسی قوم سے روابطِ اتحاد کبھی استوار نہیں ہو سکتے۔ روابط کی پائندگی حقائق کے اعتراف پر مبنی ہے اور حقیقت یہی ہے کہ مسلمان اپنی ذات میں ایک مستقل قوم ہے اور اس کی قومیت کا مدار اس کا مخصوص فلسفۂ زندگی اور ممتاز تصورِ حیات ہے۔ اور اقلیتوں کا تحفظ دنیا کی ہر شریف مملکت کا انسانی فریضہ ہے جو کسی سیاسی شرط سے مشروط نہیں۔

معراجِ انسانیت۔ از پرویز

حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ قرآن کے آئینہ میں۔

تمام کتبِ سیر سے ممتاز اور بے نظیر کتاب

ضخامت قریباً نو سو صفحات۔ قیمت بیس روپے

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

آپ کے شہر میں
طلوعِ اسلام کی ایجنسی نہیں ہے تو قائم کیجئے

نمونہ کا پرچہ اور شرائط ایجنسی ادارۂ طلوعِ اسلام سے طلب کیجئے۔

مہاجرین کا مسئلہ

ہندوستانی معاصر "قومی آواز" نے ایک قریبی اشاعت کے اداریہ میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کیوں ترک وطن کر رہے ہیں۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

> یوپی کے چار پانچ ضلعوں سے مسلمان برابر پاکستان بھاگ رہے ہیں، وہ کیوں بھاگ رہے ہیں؟ یہ سوال کچھ ایسا ٹیڑھا نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس سوال کا سمجھنا بے حد آسان ہے۔ ان ضلعوں میں سے کسی ضلع میں جائیے وہاں گھومئے، مسلمانوں کو سامان بیچتے ہوئے دیکھئے، کتنا قیمتی سامان کتنے میں فروخت کرتے ہیں، اس کا اندازہ لگائیے، سامان میں کیا کیا چیزیں ہیں یہ دیکھئے، پھر مسلمانوں سے کچھ باتیں کیجئے کہ وہ ہندوستان سے کیوں جا رہے ہیں؟ پاکستان کیا کیا امیدیں لے کر جا رہے ہیں اور ان امیدوں کی بنیاد کیا ہے؟ اس کے بعد آپ بھگدڑ کی وجہ اس طرح سمجھ جائیں گے کہ پھر آپ کو کوئی شخص غلط فہمی میں مبتلا نہ کر سکے گا۔
>
> ہاں ایک شرط ہے وہ یہ کہ انسانی فطرت کو نہ بھول جائیے گا۔ یہ بات دھیان میں رہے کہ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے، اور جس فضا میں اور جن لوگوں میں پروان چڑھتا ہے، ان سے جدا ہونا اس کیلئے زندگی کی بڑی مسرتوں سے جدا ہونا ہوتا ہے۔ شاعر یادِ وطن میں جو آنسو ادب کی پیدائش کے دن سے لے کر آج تک بہا رہا ہے وہ مصنوعی موتی نہیں ہیں، وہ دل کے سچے جواہر ریزے ہیں۔
>
> ہاں تو سوال یہ ہے کہ مسلمان کیوں پاکستان جا رہے ہیں؟ بلکہ اگر انسانی فطرت کو بھول کر اس سوال پر غور نہیں کرنا ہے تو اس کو یوں دیکھنا چاہئے کہ مسلمان کیوں اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر جلاوطن ہو رہا ہے؟ وہ کیوں آم کے باغوں، کوئل کی کوکوں، ساون کی پھواروں، بزرگوں کے مزاروں، باپ دادا کی ہڈیوں کو چھوڑ رہا ہے؟ چھوڑنا تو ایسا چھوڑنا! ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑنا!! یہ بات بھی یقینی ہے کہ بھاگنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو نامعلوم مستقبل کی طرف جا رہے ہیں اور جن کے دلوں کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ خدا جانے پاکستان میں کیسی گزرے۔ یہ سمجھنا بھی غلطی ہوگی اور انسانی فطرت سے ناواقفیت ہوگی کہ بھاگنے والوں میں ہر شخص یا ان کی اکثریت اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہے۔

ذرا یہ بھی دیکھئے کہ جانے والے کون کون سا سامان بیچ رہے ہیں؟ سلائی کی مشینیں، ریڈیو سیٹ، سائیکلیں، قالین، ڈرائنگ روم فرنیچر، مسہریاں، ڈنر سیٹ، چائے کے بڑھیا سیٹ، قیمتی کپڑے، سوٹ، کمبل اور دوشالے، دیگیں وغیرہ، یہ سب سامان کوڑیوں کے مول بک رہا ہے۔ سلائی کی مشینیں بیس بیس روپے میں، بائیسکل تین روپے میں، ریڈیو سیٹ پچاس پچاس روپے میں۔ اور مکان جو چاہے اس پر قبضہ کر لے۔ بیچنے والے کون کون ہیں؟ کاریگر، مزدور، پیشہ ور، کسان، نچلے اوسط طبقے کے لوگ، اوپر کے اوسط طبقہ کے لوگ، بڈھے، اپاہج، عورتیں، برقع پوش عورتیں، بچے۔

ان لوگوں سے ملئے اور یہ پوچھنے سے پہلے کہ وہ کیوں جا رہے ہیں یہ پوچھئے کہ ان کی زندگی میں پاکستان بننے کے بعد سے کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ آپ سے اوپر طبقے کے لوگ کہیں گے کہ وہ دو پشتوں سے سرکاری ٹھیکے دار تھے لیکن اب ٹھیکے ان کی بجائے نئے لوگوں کو دیئے گئے ہیں، اس وجہ سے ان کی آمدنی بند ہو گئی ہے۔ ایک باپ کہے گا کہ اس کے چار لڑکے ہیں چاروں کے چاروں تعلیم یافتہ بے کار پڑے ہوئے ہیں، دفتر کے لوگ درخواستیں تک نہیں لیتے۔ مقابلہ کے امتحانوں میں وہ بیٹھتے ہیں تو آتے نہیں، اس بیکاری سے فاقوں کی نوبت آ گئی ہے، دکاندار رونا روئے گا کہ بازار اور خرید و فروخت کا رنگ کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ اس کا کام ہی نہیں چلتا۔ کاریگر کہیں گے کہ ان کو کام نہیں ملتا ہے۔ دھوبی کہیں گے کہ کپڑا دینے والے کہتے ہیں کہ اگر تم کپڑے لے کر پاکستان بھاگ گئے تو؟ یہی بات درزی بھی کہے گا۔ اب سوال کیجئے کہ تمہارے ضلع کے سرکاری افسران اور کانگریسی اور پبلک کارکنوں کا کیا حال ہے تو وہ ان میں سے بہتوں کی برائی کریں گے اور چند کی تعریفیں، پھر کہیں گے کہ حکومت برائی کرنے والوں کو نہ سزا دیتی ہے اور نہ اچھائی کرنے والوں کی تعریف کرتی ہے۔ بھاگنے والے ٹنڈن جی کی تقریروں کا تذکرہ کریں گے اور کہیں گے کہ ان تقریروں سے بڑے کانگریسی اور پبلک کارکن شیر ہو جاتے ہیں اور ہم کو ستانے لگتے ہیں اور وہاں وہ اپنے پڑوسیوں کی شکایت کریں گے جو ان کو ایک دو طریقوں سے نہیں سینکڑوں طریقوں سے تنگ کرتے ہیں جس سے وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس سرزمین میں ان کے لئے جگہ نہیں۔

یہ ایک اچٹتی ہوئی تصویر ہے حالات کی۔ اب بتائیے کہ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد آپ کیا نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسلمان کیوں بھاگ رہا ہے؟

پاکستان کاریگروں کو بلا رہا ہے[1] ــ ٹھیک ہے۔ سابق لیگی بھڑکا رہے ہیں ــ ٹھیک ہے۔ بھاگنے والے اپنے جرم کو ہلکا کرنے کیلئے بہتوں کو ساتھ لے کر بھاگنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی درست اور اسی قسم کی درجنوں باتیں درست ہیں، لیکن

---

[1] ہندوستان میں بیٹھ کر تو یہ کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہاں ہمیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ان کو بھروسہ نہیں ہے کہ ان کے وطن میں ان کا جان و مال محفوظ ہے اور ان کی ترقی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اور نہ اس بات کا یقین ہے کہ مشرقی بنگال میں اگر پھر کچھ ہوا تو اس کا بدلہ ان سے نہیں لیا جائیگا۔

یہ ہے منطقی اور بنیادی وجہ مسلمانوں کے بھاگنے کی۔۔ اس کے علاوہ جو وجہ بتلائی جاتی ہے اسے ماننا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے معاصر نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے اور مسلمانوں کے ترکِ وطن کی "بنیادی وجہ" کو "منطقی طور پر" بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت اپنے آپ کو کس قدر بے چارہ و بے یار و مددگار محسوس کرتی ہے اور کس بدحواسی اور سراسیمگی کے عالم میں ترکِ وطن کر رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان اپنی جان و آبرو محفوظ نہیں پاتے اور انھیں ملکی حکومت پر اعتماد نہیں رہا کہ وہ ان کے لئے ایسی فضا پیدا کرے گی جس میں وہ امن و اطمینان سے آبائی گھروں میں جی سکیں۔ پاکستان ایسے مہاجرین کے لئے جنت نہیں اور نہ ان مظلومین کو پاکستان میں اپنے مستقبل کے متعلق غلط فہمی ہے۔ یہاں کے حالات سے وہ باخبر ہیں اور اگر وہ اپنے مستقبل کا کچھ بھی اندازہ کر سکتے ہیں تو وہ اسے یقیناً تاریک دیکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ لاکھوں کی تعداد میں اپنا اثاثہ کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر کے اور گوناگوں صعوبات سفر برداشت کر کے پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ انھوں نے تین سال تک اپنے ملک ہندوستان سے چپکے رہنے کی کوشش کی۔ اگر انھیں پاکستان میں آ بسنے کا کچھ ایسا ہی شوق ہوتا تو یقیناً تقسیم کے فوراً بعد ہندوستان کو خیرباد کہہ دیتے اور یہاں چلے آتے۔ نہ یہ بطیبِ خاطر آ رہے ہیں اور نہ انھیں کسی منظم منصوبہ کے ماتحت ہی لایا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس انھیں پاکستان میں ناخواندہ سمجھا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود پناہ گزینوں کا سیلاب ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔

یہ کوائف ایسے نہیں کہ انھیں شائستہ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ان پر پوری سنجیدگی سے غور کیا جائے اور ان کا حقیقی تدارک کیا جائے۔ پاکستان اور ہندوستان کا اقلیتی معاہدہ اسی صورتِ حال کے مداوا کے لئے طے پایا ہے۔ دونوں حکومتوں نے اس عہد کو دہرایا ہے کہ وہ اپنی اپنی حدودِ مملکت میں اقلیتوں کو پوری آزادی دیں گی اور ان کے جان و مال کے تحفظ کی ضامن ہوں گی۔ بڑے خوش آئند الفاظ اور روح پرور جذبات ہیں۔ اس معاہدے کو طے ہوئے دو ماہ ہونے کو آئے ہیں دونوں حکومتوں کی طرف سے اعلانات ہو رہے ہیں کہ معاہدہ پر مناسب عمل درآمد ہو رہا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس کی حدود میں اس پر عمل درآمد کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کی ترکِ وطن کی تحریک ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو پاکستانی ہندو افراتفری میں ہندوستان چلے گئے تھے وہ واپس آ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی معتدبہ تعداد واپس پہنچ گئی ہے اور ہر روز کافی تعداد میں پہنچ رہی ہے۔ یہ ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ پاکستانی حکومت نے ایسے

حالات پیدا کردیئے ہیں اور ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے ہندوؤں کے دلوں میں یہ اعتماد پیدا ہوگیا ہے کہ وہ پاکستان میں محفوظ رہیں گے اور اب ان کے ترکِ وطن کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اس کے برعکس ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اندازہ قومی آواز کے محولہ بالا اداریہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں آسام اور مغربی بنگال سے کوئی گیارہ لاکھ مسلمان ہجرت کرکے آچکے ہیں۔ سندھ میں روزانہ چار ہزار کی تعداد میں یوپی وغیرہ علاقوں سے مسلمان آرہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار تشویشناک ہیں۔ ان کی تشویشناکی اور بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اقلیتی معاہدہ کے دو ماہ بعد تک بھی یہ سلسلہ رک نہیں سکا۔ ظاہر ہے کہ معاہدے از خود جادو نہیں ہوتے کہ ان کے طے پاتے ہی مطلوبہ حالات پیدا ہو جائیں۔ حالات میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی اور معاہدات نتیجہ خیز نہیں ہوسکتے جب تک کہ معاہد فریقوں کی ذہنیتوں میں بھی مطلوبہ تبدیلی نہ پیدا ہو جائے۔ ہندوستانی ذہنیت میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی یا نہیں؟ اس کا جواب مندرجہ بالا اعداد و شمار میں تلاش کیجئے!

ان حالات میں ضرورت ہے کہ ہندوستان کو یاد دلایا جائے کہ اقلیتی معاہدہ کے پیش نظر ایسی امن اور اعتماد کی فضا پیدا کرے کہ مسلمان اپنے آپ کو ترکِ وطن پر مجبور نہ پائیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حکومت پاکستان نے اس ضمن میں کیا اقدام کیا ہے۔ البتہ جو اطلاعات اخبارات میں شائع ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ شہاب الدین صاحب نے مسلمانانِ ہندوستان سے اپیل کی ہے کہ وہ ہندوستان نہ چھوڑیں۔ نیز یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ حکومت پاکستان سندھی سرحد کو مسدود کردیگی اور مہاجرین کو پاکستان میں داخل ہونے سے روکے گی۔ خواجہ شہاب الدین صاحب کی مسلمانانِ ہندوستان سے اپیل کہ وہ ترکِ وطن نہ کریں، قابلِ فہم ہے لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ یہ یک طرفہ ہے۔ اپیل تو دراصل حکومت ہندوستان سے ہونی چاہیے تھی کہ وہ مسلمانوں کی تالیفِ قلوب کرے۔ اسی طرح سندھی سرحدات کو مسدود کرنے کا فیصلہ بھی ایسا نہیں جسے سراہا جاسکے۔ کہا جاتا ہے کہ حکومتِ پاکستان معاہدہ کی رو سے ایسا کرنے میں حق بجانب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حکومت کو یہ آئینی حق حاصل ہو لیکن مسئلہ زیرِ نظر کی اہم ترین حیثیت انسانی ہے آئینی نہیں۔ ہمارے اپنے وضع کردہ آئین و قانون کے تقاضے انسانی تقاضوں پر قربان کیے جاسکتے ہیں۔ یہ فیصلہ ایسا ہے جیسا سیلاب سے بچنے کے لئے اپنے دروازے کے سامنے تو بند باندھ دیا جائے لیکن سرچشمۂ سیلاب کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ طغیانِ سیلاب کے سامنے یہ بند ٹھہر نہیں سکے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مہاجرین اب پاکستان آرہے ہیں انھیں کس منطقی استدلال سے روکا جارہا ہے؟ پاکستان کی موجودہ آبادی کا ایک عنصر تو وہ ہے جو تقسیم سے پیشتر بھی انہی علاقوں میں آباد تھے اور بعد میں پاکستانی کہلائے۔ دوسرا عنصر ان مہاجرین کا ہے جو تقسیم کے بعد ہندوستان کو ترک کرکے یہاں آباد ہوگئے۔ اصولاً پاکستان میں آباد ہونیکا حق

یا تو صرف ان لوگوں کو حاصل ہونا چاہیئے جو تقسیم سے پیشتر بھی یہیں آباد تھے، یا ہر اس شخص پر پاکستان کا دروازہ کھلا ہونا چاہیئے . . . . یہاں منتقل ہونا چاہتا ہے۔ ذرا دیکھئے کہ جو لوگ تقسیم کے وقت ہندوستان سے پاکستان آگئے انھیں یہاں آکر آباد ہونے کا کیا حق تھا؟ اگر انھیں محض اس لئے پاکستان میں آنے کی اجازت مل گئی کہ وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوگئے تھے یا انھوں نے از خود پاکستان کو ہندوستان پر ترجیح دی . . . تو یہی پوزیشن ان مہاجرین کی بھی ہے جو اب ہندوستان سے ہجرت کرکے آرہے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے بیسیوں برس کی پوری قوت سے لگایا کرتے تھے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ۱۹۴۵ء-۴۶ء کے انتخاباتِ عامہ میں نامساعد حالات میں نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر مسلم لیگ کو ووٹ دیئے اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ مسلمانانِ ہندوستان کی غالب اکثریت مطالبۂ پاکستان کی موید ہے، تشکیلِ پاکستان میں پورا حصہ لینے کے باوجود یہ لوگ ہندوستان میں رہے اور مسلمان ہونے کی پاداش میں جو قیامت بھی ان پر نازل ہوئی اس کو برداشت کیا مگر انھوں نے پاکستان پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا۔ ان کے مقابلہ میں ان کے قائد جو ہندوستان میں تقسیم کے بعد بالکل امن و اطمینان سے بیٹھے تھے، نہ ان کے گھر لٹے تھے، نہ جانیں تلف ہوئی تھیں، نہ عصمتیں برباد ہوئی تھیں، غرضیکہ ان کا بال تک بیکا نہیں ہوا تھا، انھوں نے جب دیکھا کہ پاکستان میں لوٹ مچ رہی ہے تو وہ دیوانہ وار لپکے اور مسلمانوں کو موت کے منہ میں دھکیل کر پاکستان آگئے۔ یہاں آکر انھوں نے زمین جس چیز کو سمیٹا، اس پر قبضہ کیا، اس کو الاٹ کرایا، اسے ہتھیایا۔ چنانچہ اس طرح وہ پاکستان کے اجارہ دار بن بیٹھے۔ قوم کی قربانیوں کا یوں فائدہ اٹھا کر اور پاکستانی مالِ غنیمت کو غصب و ہضم کرکے اب وہ چودھری بن بیٹھے ہیں۔ اور جو کوئی ہندوستان سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ بے چارہ جان اور آبرو بچانے کے لئے پاکستان کا رخ کرتا ہے تو یہ چودھری چلا چلا کر اسے کہتے ہیں کہ واپس چلے جاؤ، یہاں جگہ نہیں ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ان چلانے والوں کو آخر ان بدقسمت مہاجرین پر کیا فوقیت حاصل ہے؟ اگر ان بھگوڑوں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ مل سکتا ہے تو ان بیچاروں کو کیوں محروم رکھا جائے؟ موجودہ مہاجرین جن پر پاکستان کے در و بام بند کئے جا رہے ہیں، ان کی ہمت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے وحشت اور درندگی کا استقامت سے مقابلہ کیا۔ یہ سخت جان یقیناً اپنے محاذوں پر ڈٹے رہتے مگر ان کی حالت مستضعفین کی سی انہی مفرورین ملت نے بنائی۔ وہ قائدین جن کے سہارے پر مسلمانانِ ہندوستان نے جنگِ پاکستان لڑی تھی ایک ایک کرکے پاکستان بھاگ آئے۔ ان کے بھاگ آنے سے جو بھگدڑ مچی اس میں سرفروشانِ ملت پس گئے۔ چنانچہ آج وہ انتہائی بے چارگی اور شکست خوردگی کے عالم میں سوئے پاکستان آرہے ہیں، بے یار، بے گھر، بے مقصد بے امام! اُدھر سے ان کو نکالا جا رہا ہے اور اِدھر سے ان کو دھتکارا جا رہا ہے۔ اگر ان کے سابق قائدین اس نفسا نفسی

کی فضا میں انھیں تنہا چھوڑ کر بیٹھ پا افتادہ مفادات کی طمع میں بھاگ نہ آتے تو ان کے سہارے قائم رہتے اور وہ پیش نظر حوادث و نوازل کا مردانہ وار مقابلہ کرتے۔ جب کوئی انھیں للکارنے والا نہ رہا تو ان کے حوصلے ٹوٹ گئے اور اوسان خطا ہو گئے۔

تو کیا اُن لوگوں کو جو ان مظلومین کی مظلومیت کا حقیقی سبب ہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کی امداد کرنے کی بجائے ان کو ٹھکرا دیں؟ اگر یہ ممکن یا مناسب ہے کہ ان کو پاکستان میں آنے سے روکا جائے اور زبردستی موت کے منہ میں جھونک کر ہندوستان رہنے پر مجبور کیا جائے تو کیوں نہ ان سے پہلے اُن قائدین کو واپس بھیجا جائے جو ان کی مصیبتوں کے ذمہ دار بنے؟ ان کے واپس جانے سے ان جانبازوں کے آسرے پھر سے قائم ہو جائیں گے اور ان کے قدم جم جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کریں گے اور اپنی جنگیں خود لڑیں گے اور پاکستان سے استمداد کرنے یا اس پر بوجھ بننے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لائیں گے۔

ہم پھر دہراتے ہیں کہ یا تو پاکستان کے دروازے ہر اس شخص کیلئے کھلے ہونے چاہئیں جو یہاں پناہ حاصل کرنے کے لئے آنا چاہے، یا ہر اس شخص پر بند ہونے چاہئیں جو ہندوستان سے بھاگ کر آیا۔ اقلیتی معاہدہ اپنی جگہ پر قائم و برقرار لیکن اس مسئلہ کی "انسانی حیثیت" کا انکار نا ممکن ہے۔ اگر ہم لفظاً اور معناً معاہدہ کے مطابق مسلمانانِ ہندوستان کا ہندوستان میں مناسب و مطلوبہ تحفظ نہیں کرا سکتے تو ہمیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم پاکستان کے دروازے ان پر بند کر دیں۔ اور یہ کہ ان کا واقعی تحفظ ہو گیا ہے، اس کا ثبوت یہ اور صرف یہ ہے کہ وہ لوگ پاکستان کی بجائے ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دیں۔

انمول

پاکستانی طبیب کی سائنٹیفک ایجاد

پائیوریا کی بو، ماسخورہ، مسوڑھوں کا پلپلا اور ڈھیلا ہو جانا، خون بہنا اور ہزار قسم کی معدہ اور منہ کے امراض کی جڑ کاٹنے کے لئے آپ اس دوا کا استعمال کیجئے جو مسوڑوں کو پیپ اور خون سے پاک کرتی ہے اور مضبوط اور خوش رنگ بناتی ہے۔ منہ کی بدبو دور کرتی اور دانتوں کی عمر بھر حفاظت کرتی ہے پاکستان اور ہندوستان تو کیا یورپ بھر میں کوئی دوا اتنی سریع الاثر ایجاد نہیں ہوئی۔ دانت نکلوانے سے پہلے ایک بار ضرور آزمائیں۔ لاجواب دوا ہے جو **حکیم یوسف حسن صاحب کی ایجاد ہے۔**

ملنے کا پتہ: مرکزی یونانی دوا خانہ۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج روڈ۔ راولپنڈی۔

رفتارِ عالم

مہاجرین کا غیر مختتم سیلاب

پاکستان و ہندوستان کے باہمی مناقشات کو دُور کرنے کیلئے جو کوشش وزیرِ اعظم پاکستان کے سفرِ دہلی سے شروع ہوئی تھی اسی کے سلسلہ میں ۲۶ اپریل کو پنڈت نہرو، وزیرِ اعظم ہندوستان کراچی تشریف لائے۔ ان کے دو روزہ قیام کے دوران میں لیاقت علی خاں سے کشمیر، تارکینِ وطن کی جائدادوں اور نہری پانی وغیرہ تنازعات کے بارے میں بحث و تمحیص ہوئی۔

ان باہمی مذاکرات نے تلخی اور ناخوشگواری کی فضا کو بظاہر دوستی اور خیر سگالی کے جذبات سے معمور کر دیا ہے۔ لیکن عملاً کیفیت یہ ہے کہ ہندوستان سے مفلوک الحال مہاجرین بدستور اسی رفتار سے پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ ۲ مئی کو پاکستان کے نائب وزیرِ مہاجرین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بتایا کہ ہندوستان سے ہر روز قریباً چار ہزار مہاجرین انتہائی قابلِ رحم حالت میں سندھ آ رہے ہیں۔ ان مہاجرین کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹر قریشی کے الفاظ میں یہ رفتار پریشان کن ہے، کیونکہ سندھ میں پانی، رہائش اور سائے کی شدید قلت ہے اور طبی امداد نا قابلِ ذکر ہے۔ مشرقی پاکستان میں داخل ہونے والے مہاجرین کی تعداد کوئی گیارہ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یکم مئی کو وزیرِ مہاجرین، خواجہ شہاب الدین نے مہاجرین کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان واپس چلے جائیں کیونکہ وہاں کے حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ لیکن جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی کسی ٹھوس ضمانت کے بغیر انھیں یہ کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی اکثریت کی ذہنیت محض ایک کاغذی میثاق تیار کرنے سے بدل گئی ہے۔

حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ۲۷ مئی سے سندھ جودھپور کی سرحد بند کر دیگی تاکہ ادھر سے مہاجرین حدودِ پاکستان میں نہ داخل ہو سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فیصلہ معاہدہ کی رو سے حق بجانب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ از روئے معاہدہ حکومتِ پاکستان کو ایسا اقدام کرنے کا حق حاصل ہو لیکن جہاں تک مہاجرین کے مسئلہ کے حل کا تعلق ہے وہ یوں دروازے بند کر دینے سے تو حل نہیں ہو جائیگا۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ حکومتِ ہندوستان سے مل کر ہندوستان میں امن و اعتماد کی ایسی فضا پیدا کرائے جس سے یہ مہاجرین خود بخود اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور آئندہ ترکِ وطن کی ضرورت محسوس نہ کریں۔

پھر تقسیمِ کشمیر!

پاکستان و ہندوستان میں باہمی مودت کی ان کوششوں کے ساتھ ہی کشمیر کے متعلق تشویشناک خبر

آنا شروع ہوئیں۔ ۳ مئی کو کشمیر کے ناظم استصواب امیر البحر نمٹز نے لیک سکیس میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا کہ یہ غیر ممکن نہیں کہ قضیۂ کشمیر کو کسی قسم کی رائے شماری کے بغیر دونوں ملکوں کے باہمی افہام و تفہیم سے ہی طے کر لیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ

میں نے یہ نظریہ زیادہ تر بعض ان بیانات سے قائم کیا ہے جو چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان نے انہی دنوں کراچی میں دیئے ہیں۔

اس کے تین روز بعد لندن کے اخبار ٹائمز نے یہ شر انگیز تجویز پیش کی کہ کشمیر کو التوائے جنگ کی موجودہ حدود کی بنا پر تقسیم کر دیا جائے اور اگر ضرورت ہو تو وادی میں رائے شماری کرائی جائے۔ دوسری صورت اس اخبار نے یہ پیش کی کہ وادیٔ کشمیر کو پانچ دس سال کے لئے الگ خود مختار ریاست بنا دیا جائے اور اس کے بعد جب کشمیری کوئی واضح فیصلہ کر سکنے کے قابل ہو جائیں ان کی رائے شماری کر لی جائے۔ اس کے علاوہ بعض امریکی جرائد نے بھی تقسیم کا راگ الاپا۔

کشمیر کے مستقبل کے متعلق نمٹز اور ٹائمز کے خیالات نے قدرتی طور پر ایک اضطراب پیدا کر دیا۔ چودھری ظفر اللہ خاں کے جن بیانات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا ان میں سے ایک انھوں نے ۲۵ اپریل کو کراچی میں اخباری نمائندوں کی ایک محفل میں دیا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا:

اگر دونوں ملک چاہیں تو کشمیر کے مسئلہ کو مجلس تحفظ سے باہر ہی حل کر سکتے ہیں۔ اگر وہ باہمی رضامندی سے مجلس تحفظ کے بغیر ہی کوئی مفاہمت کر لیں تو انھیں ایسا کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

۳ مئی کو ربوہ میں انھوں نے جو تقریر کی تھی اس میں انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو پاکستان کے واضح اعلانات کے خلاف ہو۔ اوون ڈکسن کے تقرر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے یہ کہا تھا کہ وہ (اوون ڈکسن) ان اختلافات کو رفع کریں گے جو کشمیر کمیشن کی قرارداد کی توجیہوں کے بارے میں پاکستان اور ہندوستان میں پیدا ہو چکے ہیں اور فوجیں ہٹانے کا کام مکمل کرا کر وہ امیر البحر نمٹز کے لئے رستہ ہموار کریں گے۔ اس تقریر میں انھوں نے کسی جگہ بھی اس قسم کا اشارہ نہیں کیا کہ رائے شماری کا خیال ترک کر دیا جائے گا یا ترک کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران میں متعدد بار اس حقیقت کا پھر اعلان کیا کہ مسئلہ کشمیر کا واحد حل آزاد و غیر جانبدارانہ رائے شماری ہے۔

کشمیر کے لئے اقوام متحدہ کے نمائندہ سر اوون ڈکسن ۲۶ اپریل کو سڈنی سے لیک سکیس پہنچے۔ وہاں ضروری معلومات فراہم کرنے کے بعد وہ اپنے مفوضہ فرائض کی سر انجام دہی کے لئے مئی کے آواخر میں برعظیم ہندو پاک پہنچیں گے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ریاست سے فوجیں ہٹانے کے متعلق پانچ ماہ کی جو مدت مقرر کی گئی تھی اس میں سے دو ماہ گذر چکے ہیں۔ نمائندہ کے

تقرر کی قرارداد ۱۴ مارچ کو منظور کی گئی تھی) بایں ہمہ سرادن ڈکسن بامید ہیں اور انھیں یقین ہے کہ وہ اس قلیل وقت میں بھی مفوضہ فرض کی تکمیل کر سکیں گے۔

وزیر اعظم کا سفر امریکہ

۲۹ اپریل کو لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان بعزم امریکہ روانہ ہوگئے۔ اس موقع پر امریکہ کے اخبارات اور ذمہ دار حضرات کی طرف سے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا گیا۔ لیاقت علی خاں کو "اعلیٰ پایہ کا سیاستدان" اور پاکستان کو "مسائل عالم میں اہم حیثیت کا مالک" کہا گیا۔ ۲ مئی کو وزیر اعظم نے لنڈن میں یہ کہا کہ

> ہم ایک نئی مملکت ہیں اور اس لحاظ سے ہم کسی "ازم" (ism) کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتے۔

۴ مئی کو امریکی کانگرس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا؛

> ہم نے ہمیشہ اپنے پیش نظر جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور مجلسی انصاف کے وہ اصول رکھے ہیں جو اسلام پیش کرتا ہے۔

اسی طرح ۶ مئی کو امریکی و غیر ملکی نمائندگانِ جرائد کی ایک محفل میں جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا ان کی رائے میں پاکستان کو اپنی قسمت مغربی جمہوریتوں کے ساتھ وابستہ کرنی چاہیئے تو انھوں نے جواب دیا کہ

> ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے پاکستان امن چاہتا ہے اور قیام امن کی خاطر وہ اپنی پوری کوشش صرف کرے گا۔ وہ دراز دستی کرنے والے کا کبھی ساتھ نہیں دے گا۔

امریکہ میں ان کا گرم جوشانہ خیر مقدم ہوا ہے لیکن ۴ مئی کو جب لیاقت علی خاں کانگرس کے ایوانِ اعلیٰ میں تقریر کرنے گئے تو حاضری کی یہ کیفیت تھی کہ کورم پورا ہونے کیلئے نصف گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑا۔ وزیر اعظم نے ایوان کے صرف ایک تہائی ارکان سے خطاب کیا جو اس انداز سے بیٹھے ہوئے تھے گویا انھیں اس کارروائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ امریکہ کے "نیوز ویک میگزین" نے اس "بدتہذیبی" پر امریکیوں کو بڑی سرزنش کی ہے۔

اگر پاکستان اپنی خارجی پالیسی آزاد رکھے اور دونوں متخالف بلاکوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے کسی ایک کا بھی ساتھ نہ دے تو وہ دونوں بلاکوں سے دوستانہ روابط رکھ کر اپنے لئے مناسب فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں وزیر اعظم کا دورہ امریکہ واقعی مفید ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس کے نتائج کا انتظار کرنا ہوگا۔

روس کے خلاف جمعیت بندی

امریکہ کمیونزم کی روز افزوں یلغار سے پریشان ہے وہ اسے روکنے کی خاطر ہر اس اڈے کا سہارا لینا چاہتا ہے جو اس مقصد کے لئے اس کے کام آسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ دیگر اقوام و ممالک کے امور میں ضرورت سے زیادہ دخیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ بدستور ایٹم بم پر ہے۔ چنانچہ

ٹرومین نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امریکہ کو یہ دھمکی بھی دی کہ "اگر ضرورت پڑی تو میں دوبارہ ایٹم بم استعمال کرنے کا حکم دوں گا کیونکہ پچھلی دفعہ" جب یہ بم جاپان پر استعمال کیا گیا تھا تو اس نے لاکھوں جانیں تباہ ہونے سے بچالی تھیں"۔

۶ مئی کو امریکہ کے وزیر خارجہ، ڈین ایچی سن نے اقوام مغرب سے اپیل کی کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اپنی جمعیت بندی کریں "تاکہ دنیا کو کمیونزم سے جو خطرہ درپیش ہے اس کا مقابلہ کیا جاسکے"۔ ۸ مئی کو بحر الکاہل میں امریکی بحری بیڑے کے کمانڈر انچیف، امیر البحر ڈبلیو ریڈ فورڈ، نے کہا کہ "آج جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم ایک بہت ہی خطرناک صورت اختیار کرچکا ہے"۔ امریکہ میں اس مطلب کی بھی تحریک شروع ہوگئی ہے کہ موجودہ بین الاقوامی ادارہ سے روس کو بالکل بے دخل کردیا جائے۔ امریکہ کے ایک سابق صدر، ہوورنے یہ تجویز پیش کی ہے کہ موجودہ اقوام متحدہ کو ختم کرکے روس اور روسی حلقہ بگوش ممالک کے بغیر اس کی تشکیل از سرنو کی جائے۔

امریکہ اور روس کی اس کشمکش کا نتیجہ ہے کہ جاپان کی صلح کا مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے۔ اس معاہدہ سے متعلق کانفرنس میں روس اور کمیونسٹ چین کی شمولیت سے امریکہ خائف ہے۔ روس جاپان پر سے بیرونی (امریکی) تسلط ختم کردینا چاہتا ہے۔ آئندہ جنگ میں جاپان امریکہ کے لئے بہترین اڈہ کا کام دے سکتا ہے۔ وہ اسی لئے جاپان سے بے دخل نہیں ہونا چاہتا اور روس اسی وجہ سے اسے وہاں سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ اس کشمکش میں جاپان میں بے چینی بڑھتی جارہی ہے اور کمیونزم کے حق میں فضا سازگار ہوتی جارہی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی قوت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

ہند چینی

جزیرہ ہینان میں کمیونسٹوں کے داخلہ سے ہند چینی کی صورت حالات مزید خراب ہوگئی ہے۔ یہاں سے چھوٹے چھوٹے جزائر کا ایک ایسا سلسلہ چلتا ہے جس کے ذریعے ہوچی من کو آلات حرب اور سپاہی بڑی آسانی کے ساتھ بھیجے جاسکتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار مقیم ہانگ کانگ کی اطلاع کے مطابق چین کے کمیونسٹ لیڈر، ماؤزی تنگ، اور ہند چینی کے کمیونسٹ لیڈر ہوچی من کے درمیان اس سال کے شروع میں ایک معاہدہ ہوگیا تھا جس کے بعد جنگی سامان کی ترسیل تیز تر کردی گئی ہے۔ اس اطلاع کے مطابق یہ تمام کاروائی روسی افسروں کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔

۸ مئی کو مارشل امدادی منصوبے کے منتظم مسٹر پال ہاف مین نے اس اندیشہ کا اظہار کیا ہے کہ اگر امریکہ نے مداخلت نہ کی تو ہند چینی ختم ہوجائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ

اگر امریکہ نے ہند چینی کے لئے کوئی مناسب پروگرام تیار نہ کیا تو آگے چل کر ہندوستان بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوجائیگا۔

۱۱ مئی کو امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس ہوئی اس کے سلسلہ میں یہ خبر آئی تھی کہ فرانس ایک محضر تیار کررہا ہے جس میں وہ صاف صاف کہدینا چاہتا ہے کہ وہ ہند چینی میں کمیونزم کے خلاف تنہا جنگ جاری نہیں رکھ سکتا۔

اس لئے اگر امریکہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو "ٹھوس" کارروائی کرے۔ اب تک امریکہ نے ڈیڑھ کروڑ ڈالر کی امداد کا جو وعدہ کیا ہے اسے "مضحکہ خیز حد تک قلیل" سمجھا گیا ہے۔ فرانسیسی حکام کا خیال ہے کہ امریکی امداد جدید قسم کے اسلحہ کے علاوہ، پچاس کروڑ ڈالر کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔

لندن کانفرنس کے فیصلوں کی تفصیل نہیں بتائی گئی لیکن ممکن ہے کہ جنوبی ایشیا کو امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی فوجی (Strategic) ذمہ داریوں کے علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ اغلب خیال کیا جاتا ہے کہ ہند چینی اور سیام کی ذمہ داری امریکہ، اور برما اور ملایا کی ذمہ داری برطانیہ لے گا۔

ملایا

ملایا میں گوریلا مسلح دستوں کے خلاف زبردست مہم شروع کر دی گئی ہے۔ گوریلے اب پہلے سے زیادہ منظم ہیں اور ان کی کارروائیاں تیز تر ہو گئی ہیں۔ انہی دنوں کچھ چینی کمیونسٹ گوریلا کارروائیوں کی رہنمائی کے لئے ملایا پہنچ گئے ہیں۔ گو انسدادی تدابیر بھی سخت تر ہو گئی ہیں لیکن جنوب مشرقی ایشیا کے برطانوی ہائی کمشنر جنرل کے الفاظ میں: "ملایا اور جنوب مشرقی ایشیا میں صورتِ حالات یقیناً بہت نازک ہو گئی ہے۔"

انڈونیشیا

ہالینڈ نے انڈونیشیا کو بظاہر آزاد کر دیا لیکن وہ اس آزادی کو بے حقیقت بنانے کی مکروہ سازشوں میں بدستور مصروف ہے۔ انڈونیشیا میں ۲۶ اپریل کو ایک اور بغاوت ہو گئی۔ یہ بغاوت جزیرہ ایمبون میں انڈونیشی سپاہیوں نے کی جنھوں نے جنوبی ملکاس کی ری پبلک کا اعلان کر دیا۔ اس کا لیڈر ڈاکٹر ادجوموکل ہے جو چند روز پیشتر تک مشرقی انڈونیشیا میں ولندیزیوں کی بنائی ہوئی حکومت میں اٹارنی جنرل تھا۔ ۶ مئی کو حکومت نے اس نام نہاد "جمہوریہ" کی ناکہ بندی کر دی، اب اس پر حملہ کرنے کی تیاریاں مکمل کی جا رہی ہیں۔ ۱۵ مئی کو انڈونیشیا کے ایک سرکاری ترجمان نے ولندیزی شرق الہند کی "بے قابو" فوجوں پر الزام لگایا کہ انھوں نے جنوبی ملکاس کی "جمہوریہ" کے قیام کے لئے ایمبون کی بغاوت میں حصہ لیا ہے۔ ان فوجوں نے گذشتہ جنوری میں ویسٹرلنگ کی بغاوت میں بھی حصہ لیا تھا۔

چین

چین کی کمیونسٹ فوجیں ۱۰ مئی کو چوسان جزیرہ میں داخل ہو گئیں۔ ڈیڑھ لاکھ نیشنلسٹ فوج نے "ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق" خود ہی اس جزیرے کو خالی کر دیا تھا۔ چیانگ کائی شک نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی تمام فوجی طاقت فارموسا میں اکٹھی کر لینا چاہتا ہے تاکہ کیمونسٹ اس منتشر جمعیت کو ایک ایک کر کے ختم نہ کر سکیں۔ ۲۳ اپریل کو نیشنلسٹ فوجوں نے پرامن طریق پر ہینان بھی خالی کر دیا تھا۔ جنوب میں ہینان اور فارموسا کے شمال مشرق میں چوسان پر کیمونسٹ قبضہ سے کیمونسٹ چین کی ناکہ بندی ختم ہو گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چیانگ کائی شک فارموسا کو کتنے عرصہ تک اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔ چیانگ نے چوسان سے انخلاء کے متعلق ایک نشری تقریر میں اعلان کیا ہے کہ وہ ایک سال کے اندر اندر چین پر حملہ کریگا۔

آج سے تین ماہ پیشتر بھی اس نے حملہ کے عزم کا اعلان کرتے ہوئے یہاں تک وعدہ کیا تھا کہ کمیونسٹ لیڈر ماوزی تنگ کو پھانسی دیدی جائے گی اور مارشل سٹالین پر بین الاقوامی عدالت میں جنگی مجرم کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جائے گا۔

ہندوستان ۹ رمئی کو سرکاری طور پر جو تفصیلات مہیا کی گئی ہیں ان کے مطابق ہندوستان میں بھی کمیونسٹ سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ان تفصیلات کے مطابق جنوبی ہندوستان میں حیدرآباد اور مدراس کی سرحد کے ساتھ ساتھ (کمیونسٹوں کے دعوے کے مطابق) دو ہزار سے زیادہ گاؤں، جن کا رقبہ پندرہ ہزار مربع میل ہے کمیونسٹوں کے زیر اثر ہیں۔ قتل و غارت اور ریلوں اور سڑکوں پر سابوتاژ (sabotage) کے روزافزوں واقعات کمیونسٹوں سے ہی منسوب کیا جا رہا ہے۔ کوچین اور ٹراونکور میں کمیونسٹ ہنگاموں اور مظاہروں کی رفتار تیز تر ہے۔ کلکتہ میں صورت حالات اس سے کہیں زیادہ خراب ہے۔ وزیر مملکت مسٹر سنتانم نے بتایا ہے کہ کمیونسٹ خاص طور پر حمل و نقل کو تباہ کر کے ان علاقوں میں قحط پیدا کرنا چاہتے ہیں جنہیں سڑک یا ریل کے ذریعہ خوراک پہنچائی جاتی ہے۔

حکومت ہندوستان کے اندازے کے مطابق ہندوستان بھر میں تین صد سے زیادہ روسی "تجارتی ایجنٹوں" کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ملک بھر میں روسی لٹریچر کی بھرمار حیران کن ہے۔ اشیاء کی گرانی بے روزگاری اور مزدوروں کی خستہ حالت نے کمیونزم کیلئے فضا خاصی سازگار کر دی ہے۔ شمال میں نیپال کی سرحد کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں نے کسانوں کی بغاوت کرانے کے بعد پچاس گاؤں پر قبضہ کر لیا ہے۔

لنکا لنکا کے متعلق جو تازہ ترین اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کے مطابق کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر ایس اے وِدم سنگھے، ماسکو اور پیکین سے تازہ ہدایات لے کر کولمبو واپس آ گیا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ لنکا میں کمیونسٹ سرگرمیاں بڑھ جائیں گی۔ کہا جاتا ہے کہ کمیونسٹ لیڈروں کا براہ راست رابطہ ہندوستان کے کمیونسٹوں کے ساتھ ہے۔ اشیاء کی گرانی کمیونسٹ پروپیگنڈے کیلئے کافی مواد ہے۔

سڈنی کانفرنس ۱۵ رمئی کو سڈنی میں دولت مشترکہ کی ایک اقتصادی کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس اس مقصد کیلئے بلائی گئی کہ جنوب مشرقی ایشیا کے ان ممالک کی اقتصادی ترقیع کے موثر ذرائع سوچے جائیں جو معاشی اعتبار سے پسماندہ ہیں تاکہ وہ کمیونزم کے لئے تر نوالہ نہ بن سکیں۔

۱۹ رمئی کو سڈنی کانفرنس کے ساتوں شرکا، جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا پر جس قدر جلد ممکن ہو سکے "اسی لاکھ سٹرلنگ امدادی رقم صرف کرنے پر متفق ہو گئے۔ یہ اسی لاکھ سٹرلنگ تین سال کے عرصہ میں خرچ کئے جائیں گے۔ باخبر حلقوں کے خیال کے مطابق اس رقم کے علاوہ ڈیڑھ کروڑ سٹرلنگ کی مزید رقم بھی امداد کے لئے مخصوص کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس طرح

چھ سال کے عرصہ کے لئے کل دو کروڑ تیس لاکھ سٹرلنگ خرچ کئے جائیں گے۔ لیکن اس رقم کا تعین دولتِ مشترکہ کی لندن کانفرنس میں کیا جائے گا جو ستمبر میں منعقد ہوگی۔ کمیٹی کی سفارش کے مطابق ایشیائی ممالک کو چھ سالہ منصوبہ کے مطابق تدریجی طور پر ترقی دی جائیگی جن ممالک کو امداد دی جانے والی ہے وہ یکم ستمبر سنہ۱۹۵۰ء تک اپنی اقتصادی صورتِ حالات اور ترقیات کے پروگرام کے متعلق ایک "حقیقت پسندانہ اور جامع" رپورٹ تیار کریں گے۔ اس رپورٹ پر لندن کے اجلاس میں غور کیا جائیگا۔ کارگذاری میں ربط قائم کرنے کے لئے کولمبو میں دولتِ مشترکہ کا ایک ادارہ قائم کیا جائے گا۔ کمیٹی نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے ان ممالک کو جو برطانوی دولتِ مشترکہ کے رکن نہیں ہیں، رسمی طور پر کمیٹی کے مذاکرات اور لائحہ عمل سے آگاہ کیا جائے اور ان کو بتایا جائے کہ دولتِ مشترکہ کی حکومتیں اس کام میں ان کے کامل تعاون کا خیر مقدم کریں گی۔

گذشتہ کولمبو کانفرنس کے فیصلے کے مطابق پاکستان نے برما کو پچاس لاکھ روپیہ قرضہ دیدیا تھا۔ لیکن اس کی تفصیلات کو حکومت نے اب تک ظاہر نہیں کیا اور نہ پارلیمان سے ہی استصواب کیا۔ سڈنی کانفرنس کے فیصلوں پر بھی اسی طرح اخفاء کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کی موجودہ صورتِ حالات میں ان فیصلوں کے نتائج دوررس ہوں گے۔ حکومتِ پاکستان کو ایسی نازک ذمہ داریاں سنبھالنے سے پیشتر پارلیمان سے ضرور استصواب کرلینا چاہئے۔ یا کم از کم فیصلوں کے بعد ہی پارلیمان پر اتنا اعتماد کرنا چاہئے کہ ان کے مالہٗ و ماعلیہ سے اسے آگاہ کیا جائے اور اس طرح اس کی منظوری حاصل کرلی جائے۔

اقوامِ اوقیانوس کی کانفرنس

مغربی منظریہ امن کو معاہدہ اوقیانوس کے بارہ ممالک کے وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس (لندن) میں معاہدہ کو بروئے کار لانے کے لئے اوقیانوس کی اعلیٰ کونسل (اٹلانٹک ہائی کونسل) قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ امریکہ کی یہ تجویز منظور کرلی گئی کہ نائب وزرائے خارجہ کی ایک مستقل کمیٹی قائم کی جائے جس کے اجلاس تقریباً مسلسل ہوتے رہیں۔ اس سال کے شروع میں ہیگ میں وزرائے دفاع اور چیفس آف سٹاف کے اجلاس میں مغربی دنیا کے دفاع کی جو تجاویز مرتب کی گئی تھیں لندن کانفرنس نے انہیں منظور کرلیا۔ سپین کو بھی معاہدۂ اوقیانوس میں شامل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ شاید پرتگال اپنے ہمسایہ کی وکالت کرے۔

عرب اور روس

مشرق و مغرب کی اس کشمکش میں مشرقِ وسطیٰ نے برطانیہ و امریکہ کے لئے مزید دردِ سر کا سامان مہیا کیا ہے۔ اینگلو امریکن بلاک عربوں کے مسائل کے بارے میں جو روش اختیار کئے ہوئے ہے اس کے پیشِ نظر عزام پاشا اور مشرقِ وسطیٰ کے بعض دوسرے سیاستدانوں نے اس قسم کے اعلانات کئے ہیں کہ روس کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کئے جائیں۔ مصری حکومت کے سرکاری نقیب "المصری" اور شام کے وزیر اعظم خالد بے الاعظم نے کہا ہے کہ امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل نوازی کی جس پالیسی پر چل رہا ہے اس سے عرب دنیا میں حالات بگڑتے جارہے ہیں، اور ان میں انتقام کا جذبہ پیدا

ہو جائیگا۔ اینگلو امریکن بلاک سے بددل ہو کر عربوں کی نگاہیں روس کی طرف اٹھتی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ بعض حلقوں میں اس رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ عرب ممالک کو روس سے معاہدہ دوستی کر لینا چاہیئے۔

شام کے اقتصادی امور کے وزیر ڈاکٹر معروف نے عرب ممالک کے متعلق امریکی پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ عربوں پر یہودیوں کو مسلط کرنے کے لئے امریکہ جو دباؤ ڈال رہا ہے، اگر وہ جاری رہا تو عرب یہودیت کا شکار بننے کی بجائے روسی جمہوریہ بن جانا زیادہ پسند کریں گے۔ اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے عزام پاشا نے کہا:

مجھے خطرہ ہے کہ موجودہ حالات ڈاکٹر معروف کی اس رائے کو عرب ممالک کی رائے عامہ کی حیثیت دے دیں گے۔

فلسطین کا علاقائی قتل

۲۴ر اپریل کو شاہ عبداللہ نے عرب فلسطین کو باقاعدہ طور پر اردن میں شامل کر لینے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس اعلان کی خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس اقدام سے پیشتر برطانیہ سے مشورہ نہیں کیا گیا لیکن پہلے دن سے ہی اس اقدام کو برطانوی ڈپلومیسی کی فتح سمجھا گیا ہے۔ الحاق کی اس تجویز کی خبریں سب سے پہلے برطانوی اخبارات میں ہی شائع ہوئی تھیں۔ اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے اس الحاق کو "فطری اتحاد" کا نام دیا ہے۔ ۲۷ر اپریل کو برطانیہ نے الحاق فلسطین کو تسلیم کر لیا، اور اس کے ساتھ ہی اسرائیل کو عملی طور پر تسلیم کر لینے کا بھی اعلان کیا۔ اب توقع ہے کہ ۱۹۴۸ء کے اینگلو اردن معاہدہ کے مطابق برطانوی فوجیں فلسطین میں بھی داخل ہو جائیں گی۔

الحاق سے پہلے عبداللہ نے عرب فلسطین میں انتخابات کا ڈھونگ رچایا تھا۔ فلسطینیوں نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا یا انھیں چنداں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ۱۳ر اپریل کو عرب لیگ کونسل نے عبداللہ کی اس تجویز کو ناجائز قرار دیا تھا۔ لیگ کی قراردادوں کی منظوری میں خود اردن بھی شریک تھا۔ یوں بھی جب فلسطین کی جنگ شروع ہوئی تو عربی ریاستوں نے اعلان کیا تھا کہ فلسطین کے مستقبل کا دارومدار اہلِ فلسطین کے فیصلہ پر ہے اور اس کا تعین انہی پر چھوڑ دیا جائے گا۔ عبداللہ کا اقدام اس اعلان کی صریح خلاف ورزی ہے۔ عبداللہ نے عرب لیگ کے لئے جو الجھن پیدا کر دی ہے اس کا حل عرب لیگ کے لئے دشوار ہو گیا ہے۔ عرب لیگ کے خلاف اس بغاوت کو برداشت بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر عبداللہ کو لیگ سے خارج کر دیا گیا تو خدشہ ہے کہ اگلے روز ہی وہ اسرائیل سے صلح کر لے گا۔ اس طرح لیگ ختم ہو جائیگی۔ ۲۹ر اپریل کو عبداللہ نے المصری کے نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ دھمکی دی کہ اردن کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے کی جو کوشش بھی کی گئی "میں سے توڑ کر رکھ دوں گا" اور میں اپنے ہمسایہ (یعنی اسرائیل) کے ساتھ صلح کی گفتگو شروع کر دوں گا" آج سے دو سال پیشتر عبداللہ نے ان عزائم کا اظہار کیا تھا،

اگر عربوں کے پاس گولہ بارود ختم ہو گیا تو میں اسرائیل کے خلاف پتھروں سے لڑوں گا۔

اپنی اس گفتگو میں عبداللہ نے مصریوں کے متعلق کہا کہ وہ افریقی باشندے ہیں اور عربوں کے مسائل کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ محض عرب

ممالک کی لیڈری کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

اردن کے اقدام پر غور کرنے کے لئے عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی کا اجلاس قاہرہ میں طلب کیا گیا اور ساتھ ہی اس قسم کی خبریں آنا شروع ہوگئیں کہ شاید سیاسی کمیٹی عبداللہ کے اقدام کو تسلیم کرے اور بحران پیدا نہ ہونے دے۔ ۹ مئی کو عراقی ایوان اعلیٰ کے صدر اور سابق وزیر اعظم جمیل المدفعی نے عربوں کو مشورہ دیا کہ وہ اردن کے الحاق فلسطین کو ایک "طے شدہ امر" کے طور پر منظور کرلیں۔

ان خبروں اور مشوروں کے ساتھ ہی امریکی اور برطانوی ماہرین مشرق وسطیٰ نے بھی نقل و حرکت شروع کی۔ امریکی سفیر مقیم قاہرہ امور مشرق وسطیٰ کے امریکی سفارت خانہ کے قونصل مسٹر آئرلینڈ کے ساتھ، شام، لبنان اور عراق کے دورے پر روانہ ہوا۔ امریکی سفارت خانہ کے الفاظ میں اس دورہ کا "مقصد" پرانی یادگاروں کی سیر تھا۔ مسٹر آئرلینڈ نے عزام پاشا سے ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ یہ دورہ سیاسی اہمیت نہیں رکھتا۔ ۶ مئی کو امور مشرق وسطیٰ کے برطانوی سفارت خانہ کے ماہر مسٹر جان وال نے بھی عزام پاشا سے ملاقات کی۔ ان دوروں اور ملاقاتوں سے بہت قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں اور اس یقین کا اظہار کیا گیا کہ ان سے مقصود عربوں پر دباؤ ڈالنا ہے تاکہ وہ اسرائیل کے ساتھ صلح کرلیں اور اردن کو لیگ سے خارج نہ کریں۔ اس دوران میں امریکی کانگریس کے ۱۵ ممبروں نے وزیر خارجہ ڈین ایچی سن سے مطالبہ کیا کہ جب تک عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ صلح نہ کرلیں امریکہ برطانیہ کو مجبور کرے کہ وہ عربوں کو سامان جنگ نہ دے۔ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا اور اینگلو امریکن ممالک کی سرگرمیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو علاقے آئندہ جنگ میں کس قدر اہم حیثیت کے مالک ہیں چنانچہ اب ان پر خصوصی توجہ صرف کی جا رہی ہے۔

عرب لیگ سیاسی کمیٹی کا ملتوی شدہ اجلاس ۱۰ مئی کو قاہرہ میں شروع ہوا۔ باقاعدہ اجلاس سے پیشتر پس پردہ مذاکرات کے باوصف مفاہمت کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ اردن کے نمائندہ سے یہ دریافت کیا گیا کہ شاہ عبداللہ نے اپنی تقریر میں جو یہ کہا تھا کہ عرب فلسطین کا الحاق آخری فیصلہ تک کیا گیا ہے کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ فلسطین فلسطینیوں کو واپس دیدیا جائے گا تو اس نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا،

اس اعلان کا مطلب یہ ہے کہ آخری فیصلہ کے بعد عربوں کو جو مزید علاقہ ملے گا اردن اس کا الحاق بھی کرے گا۔

کافی بحث و تمحیص اور بہت سی تلخ نوائی کے بعد ۱۵ مئی کو سیاسی کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی کہ الحاق فلسطین کا اقدام لیگ کونسل کی ۱۳ اپریل ۱۹۵۰ء کی قرارداد کی خلاف ورزی ہے۔ اردن کے سوا باقی سب چھ ارکان نے اس قرارداد کی تائید کی۔ شام، سعودی عرب، لبنان اور مصر عرب لیگ کونسل سے یہ سفارش کرنے پر متفق تھے کہ اردن کو لیگ سے خارج کردیا جائے۔ لیکن عراق اور یمن نے اپنی حکومتوں سے مشورہ کرنے کیلئے التوا کی درخواست کی۔ تادیبی کاروائی کا فیصلہ کرنے کے لئے سیاسی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ کونسل کا

اجلاس ۱۲ر جون سے پہلے پہلے بلایا جائے۔

ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ عبداللہ نے حال ہی میں اپنے اس عزم کا اعلان کیا ہے کہ اگر اردن کو عرب لیگ سے خارج کر دیا گیا تو وہ فلسطین، ترکی اور اسرائیل کے ساتھ مل کر مشرقِ وسطیٰ میں ایک نیا بلاک قائم کرے گا۔

اقوامِ متحدہ کا فلسطینی مصالحتی کمیشن نئے طریق کار کے ماتحت جو براہِ راست مذاکراتِ صلح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کی کامیابی کے امکانات روشن نظر نہیں آرہے۔ جب تک اسرائیل عرب مہاجرین کو واپس لینے پر تیار نہیں ہوتا، اردن، مصر، شام اور لبنان اس کے ساتھ براہِ راست مذاکراتِ صلح میں شامل نہیں ہوں گے۔ یہودی اس پر رضامند نہیں۔ اسرائیل نے کمیشن سے درخواست کی ہے کہ جو عرب ملک کسی شرط کے بغیر صلح کی گفتگو کے لئے تیار ہو اس کے متعلق اسے اطلاع دی جائے۔

شام

شام میں پچھلے دنوں ایک اور سیاسی بحران کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا جو بظاہر ٹل گیا ہے۔ لیکن گذشتہ سوا سال میں جس حیرت انگیز سرعت اور کامیابی سے وہاں حکومت کے تختے ایک قطرۂ خون بہے بغیر اُلٹے گئے ہیں اس کے پیش نظر موجودہ حکومت کے استقلال کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ شام کے وزیرِ دفاع نے ۷ر مئی کو دھمکی دی کہ اگر کابینہ میں تمام سیاسی جماعتوں کو مناسب نمائندگی نہ دی گئی تو ملک میں امن قائم رکھنے کے لئے فوج کو عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لینی پڑے گی۔ اس بیان سے ایک ہفتہ بیشتر وزیرِ دفاع نے اس بنا پر وزارت سے استعفیٰ دیدیا تھا کہ کابینہ ملک کی صحیح نمائندہ نہیں۔ وزیرِ زراعت مسٹر ناظم الدین نے بھی اس بنا پر استعفیٰ دے دینے کی دھمکی دی۔ ۸ر مئی کو شامی کابینہ نے استعفیٰ دیدیا۔ خالد العظم بے کی یہ وزارت گذشتہ دسمبر میں تیسرے انقلاب کے بعد مرتب ہوئی تھی۔ دو روز بعد خالد العظم کی وزارت پھر بحال ہو گئی۔

عراق

تیل کی تین کمپنیوں کی رعایتوں میں ترمیم کرنے کے لئے عراق اور برطانیہ کے درمیان جو گفتگو شروع ہوئی تھی وہ کسی سمجھوتہ کے بغیر ۱۳ر مئی کو ملتوی ہو گئی ہے۔ عراق کے وزیرِ معاشیات نے اس التوا کا سبب یہ بتایا ہے کہ کمپنیوں کے نمائندوں نے عراق کے اہم مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ عراق کا ایک بڑا مطالبہ یہ ہے کہ تیل یہودی بندرگاہ حیفہ کی بجائے بحیرۂ روم یا خلیج فارس کی کسی بندرگاہ کو بھیجا جائے۔ حیفہ کو تیل بھیجنا اپریل ۱۹۴۸ء میں بند کیا گیا تھا۔ اس طرح عراق کو مالی لحاظ سے گو نقصان ہے لیکن وہ اس مطالبہ سے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اگر عراق حیفہ کے ذریعے تیل پمپ کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کی رائلٹی، جو اب قریباً چالیس لاکھ سٹرلنگ ہے، ستر لاکھ سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔

شمالی افریقہ کا اضطراب

شمالی افریقہ کی عرب آبادی غیر ملکی استبداد کے پنجے میں کراہ رہی ہے اور آزادی کی تحریکیں زور پکڑتی جا رہی ہیں۔ ۲۸ر اپریل کو قاہرہ میں شمالی افریقہ کے دفتر نے عرب لیگ کو ایک محضر بھیجا جس میں عرب ممالک سے اپیل کی گئی کہ وہ الجیریا، مراکش اور ٹیونس کے تین کروڑ بھائیوں کو ان کی جنگ آزادی

میں سرد دیں۔ عرب لیگ سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ فرانس اور سپین پران ممالک کی آزادی کی اہمیت واضح کریں۔ اس سلسلہ میں ایک اطلاع آئی تھی کہ ٹیونشیا کی آزادی کے متعلق ادارۂ اقوام متحدہ میں رسمی تحریک پیش کی جانے والی ہے۔ ۱۷ مئی کو قاہرہ میں لیبیا کی مجلسِ حریت نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندہ کرنل عبدالرحیم خاں کو ایک محضر بھیجا ہے۔ اس میں برطانیہ پہ زور ڈالنے کی درخواست کی گئی ہے کہ ٹریپولیٹنیا میں دہشت زدگی کا جو دور شروع ہے اسے ختم کیا جائے اور مقامی باشندوں کو اظہار رائے کی آزادی دی جائے۔ پچھلے دنوں اس قسم کی خبریں بھی آئی تھیں کہ شمالی افریقہ میں امریکی اسلحہ استعمال ہو رہے ہیں۔ فرانس یہ اسلحہ مارشل امداد کے ماتحت امریکہ سے حاصل کر رہا ہے۔ شمالی افریقہ کی مجلسِ حریت کے سکرٹری نے انکشاف کیا ہے کہ ٹیونشیا میں فرانس سابق نیشنلسٹ لیڈر کیساتھ بات چیت کر رہا ہے تاکہ ٹیونشیا میں بھی "باؤ دائی طرز کی حکومت" قائم کی جا سکے۔

ترکی ۱۴ مئی کو ترکی میں پہلے آزاد عام انتخابات ہوئے۔ توقعات کے خلاف ری پبلکن پیپلز کو شکست ہو گئی ہے۔ یہ پارٹی گذشتہ ۲۷ سال سے مسلسل برسرِ حکومت رہی ہے۔ اب اسے صرف ۵۲ نشستیں حاصل ہو سکی ہیں۔ ڈیموکریٹک حزبِ مخالف نے ۴۳۴ نشستیں جیتی ہیں۔ پچھلے عام انتخابات کے بعد، جو ۱۹۴۶ء میں عمل میں لائے گئے تھے، نیشنل اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے ۴۰۲ اور ڈیموکریٹک پارٹی کے صرف ۳۲ ارکان تھے۔ اول الذکر کے قائد موجودہ صدر جمہوریہ عصمت انونو ہیں جو ۱۹۳۸ء میں کمال اتاترک کی وفات کے بعد صدر منتخب ہوئے تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے قائد جلال بایار ہیں جو خود بنکر ہیں۔ اس پارٹی کو زیادہ تر تاجر طبقہ کی حمایت حاصل ہے۔ ترکی کو صحیح معنوں میں جمہوری ملک بنانے کے لئے حزبِ اختلاف کا تجربہ خود کمال اتاترک نے شروع کیا تھا، مگر یہ مفید ثابت نہ ہو سکا اور اسے ترک کر دینا پڑا۔ ملک کی دونوں پارٹیوں کے نظریات اور طریقِ کار میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ خارجی پالیسی پر دونوں متفق ہیں۔ داخلی پالیسی میں بھی دونوں میں بہت کم فرق ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ تازہ انتخابات کے نتائج کسی مخصوص پروگرام کی پسندیدگی سے زیادہ ترکوں کی اس فطری خواہش کے مظہر ہیں کہ حکومت میں تبدیلی ہونی چاہئے۔ ۲۲ مئی کو جلال بایار جمہوریہ کے صدر منتخب ہو گئے۔

ایران اور ترکی کو مشرقِ وسطیٰ میں جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیشِ نظر حالیہ لندن کانفرنس میں ان کے مسائل کو خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹ مئی کو امریکی وزیر خارجہ ڈین ایچی سن نے لندن میں اعلان کیا کہ ۱۹۵۲ء کے بعد بھی کہ جب موجودہ مارشل منصوبہ امداد کی میعاد ختم ہو جائے گی امریکہ یونان، ترکی اور ایران اور دوسرے ممالک مثلاً ہند چینی کو روس کے خلاف برابر امداد دیتا رہے گا۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ ہو)

اسلام اور سائنس

(ایس۔ این۔ باقر صاحب، ڈپٹی سکریٹری، وزارت امورِ داخلہ)

ایک عرصہ سے نہ صرف اغیار ہی بلکہ خود مسلمانوں کی اکثریت اس افسوسناک غلط فہمی کا شکار ہے کہ اسلام اور سائنس باہم متضاد و متناقض ہیں۔ اس غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہ ممالک جنہیں "اسلامی" ممالک کہا جاتا ہے سائنسی ترقی کی دوڑ میں نمایاں طور پر پیچھے ہیں۔ نیز مسلمانوں کے رجعت پسند طبقے کا سائنس کے خلاف تعصب بھی کافی حد تک اس کا ذمہ دار ہے۔ علاوہ ازیں دنیا میں تخلیقِ آدم کے مقصدِ زندگی کے بارے میں جو غلط تصور قائم ہو چکا ہے وہ بھی اسی بے سروپا نظریے کی تائید کرتا ہے۔ یہ تصور کہ انسانی زندگی کا ماحصل "نجات" ہے جو انسان کو نفیِ ذات یا ترکِ عمل سے حاصل ہوتی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انسانی زندگی کا مقصود خودکشی قرار پائے۔ میں آج کی صحبت میں وہ داخلی اور خارجی شہادات پیش کروں گا جو ایک طرف اس سنگین مغالطہ کا ابطال کریں اور دوسری طرف یہ ثبوت بہم پہنچائیں کہ اسلام جس قدر انسان کی داخلی قوتوں (دنیائے انفس) کی پاسبانی اور تربیت پر زور دیتا ہے کم از کم اتنی ہی شدت سے وہ مظاہرِ فطرت (دنیائے آفاق) کو [illegible] اختیار میں لانے کی طرف بھی انسانی توجہ منعطف کرتا ہے۔

مذکورہ صدر غلط فہمی کی ابتدا مسلمانوں میں اس وقت ہوئی جب دین، مذہب میں تبدیل ہو کر عبادات کی قیود و حدود میں محصور ہو گیا۔ اب اسے خارجی دنیا سے کوئی علاقہ یا واسطہ نہ رہا اور اس کی مساعی مادی دنیا سے ہٹ کر ایک [illegible] ذہنی باطنیت (تصوف) یا پراسرار انفرادی واردات کے حصار میں گھر کر رہ گئیں۔ ان کا تعلق خارجی ماحول سے قطع ہو گیا اور ان کی زندگی کا تمام مقصد باطن کا مطالعہ و تربیت قرار پا گیا تاکہ اس طرح اس راستہ کی تلاش کی جائے جو بآسانی "آخرت" کی طرف لے جا سکتا ہو اور جس سے صرف دوسری دنیا سے محبت کرنے کا شوق پیدا ہو۔ ظہورِ اسلام سے قبل دیگر بے روح مذاہب اور فلسفوں نے بھی اپنے اپنے ادوار میں بعینہٖ یہی کر رکھا تھا کہ حقائق کو باطنیت (تصوف) اور اساطیر کے پرفریب رنگ میں پیش کیا جائے۔

ذہنی گمراہی کی اس کیفیت کا صحیح تجزیہ کرنے کے لئے ہمیں ظہورِ اسلام سے پیشتر کی دنیا پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ہوگی۔ چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں ہم ایک ایسی دنیا سے دوچار ہوتے ہیں جہاں زندگی دو متضاد اور باہم متناقض شعبوں

میں منقسم ہو چکی تھی۔ اس ثنویت کے مظاہر دنیائے مذہب اور دنیائے مادیت تھے۔ قیصر کا جہان الگ تھا جس میں خدا کا کچھ دخل نہ تھا۔ ارباب مذہب نے انفرادی تصور نجات پر زور دیتے ہوئے انسان کو اس طلسم ہوش ربا میں الجھایا کہ عالم محسوسات کی حیثیت فریب نظر اور واہمۂ خیال سے زیادہ کچھ نہیں اور وہ انسان اور اس کی انفرادی نجات میں ایک رکاوٹ ہے چنانچہ مذہبی بننے کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ دنیا کی ہر مادی شے سے گریز و احتراز کیا جائے۔ تارک الدنیا ہونا زندگی کا بلند ترین معیار اور زینت کا مسئلہ پیدا نہ ہونا راہداری قرار پایا۔ مذہب کے ساتھ ساتھ دنیائے علم و فلسفہ میں بھی اس ثنویت حیات کا تسلط ہو گیا۔ سقراط نے اپنا سارا علمی زور مجرد انسان یعنی ان داخلی خیالات و تصورات کے مطالعہ پر صرف کیا جو انسان کے اپنے ہی "گریبان میں منہ ڈالنے" سے پیدا ہوئے۔ اس کے شاگرد افلاطون نے حسی مشاہدات کو یک قلم مسترد کر دیا اور انھیں گناہ عظیم سے تعبیر کیا۔ یہ دراصل افلاطون ہی تھا جس نے "مایا" یا "وہم" کے تصور کو فن لطیف کے درجے تک پہنچا دیا۔ افلاطون کے پیرو بعد کے زمانوں میں اسی "مایا" کے تاروں سے "بیت عنکبوت" تیار کرتے رہے اور اس بیت عنکبوت میں وہ ایسے مقید ہوئے کہ پھر نکل نہ سکے۔ افلاطون بجا طور پر "بابائے باطنیت" (امام تصوف) کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اور یہ حلقۂ طریقت جن کے ذہن اور حیثیتوں سے کھو کھلے مگر اس خاص معاملے میں نہایت رسا تھے، انسانیت کو اپنے دماغی پیچاک کی الجھنوں میں جکڑے ہوئے کشاں کشاں لے آیا۔

تاریخ عالم کا یہی دور تھا جبکہ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کی ضیا پاشیوں نے اس تیرہ و تار دنیا کو منور کیا۔ اسلام نے قرآن کے ذریعے اُن باطل تصورات کے پرخچے اڑا دیئے جو "مایا" کے شرمندۂ تخلیق تھے اور جنھوں نے ذہن انسانی کو صدیوں سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ منظم انسانی زندگی اور فکر کی تاریخ میں قرآن نے پہلی مرتبہ اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ فطرت کی خارجی قوتیں (آفاق) اور انسان کی داخلی زندگی (انفس) ایک ہی حقیقت کے دو عملی اور تعمیری رخ ہیں۔ ہم حقائق کا مشاہدہ زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کے باہمی امتزاج و تعامل کے تحلیلی مطالعہ سے ہی کر سکتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق اور انفس میں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہی "حق" (تعمیری حقیقت) ہے۔" (۴۱/۵۳) ان دو پہلوؤں کی مکمل ہم آہنگی کے بغیر نہ حقیقت کا ادراک ممکن ہے اور نہ یہ ادراک نتیجہ خیز ہی ہو سکتا ہے۔

اپنے اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے جو زمان و مکان کی قیود سے ماوراء ہے انسانی نفس کی داخلی دنیا کا فطرت کی خارجی قوتوں سے تعاون اور تعامل لازمی ہے۔ جہاں تک داخلی یا نفسی دنیا کا تعلق ہے، قرآن نے صاف اور واضح طور پر بتا دیا ہے کہ کوئی قوم اپنی خارجی دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ ضمیر انسانی میں تبدیلی نہ ہو۔ (۱۳/۱۱ ؛ ۸/۵۳) ساتھ ہی ساتھ خارجی دنیا کے بارے میں اس حقیقت کا اعلان بھی کر دیا ہے کہ جو قوم خارجی یا فطرت کی دنیا سے فرار کی راہیں ڈھونڈتی ہے وہ ہلاکت کی طرف

جاتی ہے۔ (۲:۱۸۵)

جب قرآنِ کریم کی ان زندگی بخش تعلیمات کا تقابل جو آج سے قریب ساڑھے تیرہ سو سال قبل انسانیت کو عطا ہوئیں اس مہلک انسانیت کش فلسفے سے کیا جاتا ہے جو دنیا بھر میں رائج اور مسلط تھا تو صاف نظر آجاتا ہے کہ ظلمت اور جہالت میں ٹھوکریں کھانے والی دنیا کے سامنے علم وحیات کی مشعل جان بخش روشن کرنے کی سعادت قرآن ہی کے حصے میں آئی۔ بعد کی سائنسی ترقیات نے قرآن ہی کے حقائق کی توثیق کی ہے اور شدومد سے ان پر صاد کیا ہے۔

ارتقا کے گل سرسبد یعنی انسان کے ظہور کی داستان اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ خودنگر و خود آگاہ بن کر نہ محض قوت متصورہ کا حامل بنا بلکہ تصورات کے تجزیہ اور امتزاج سے مفرد اور مرکب تصورات تشکیل دینے کے بھی قابل ہوا۔ اس کے ظہور و ارتقا کی داستان بیان کرتے ہوئے قرآن نے انسان کو یوں متعارف کرایا ہے کہ اس نے اسماء سے اشیاء کی حقیقت کو پہچانا اور ان کے متفرق خصائص میں امتیاز پیدا کیا۔ ہبوطِ آدم کی داستان کو قرآن نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے:

> جب تیرے نشوونما دینے والے نے ملائکہ سے ارشاد فرمایا کہ میں ایک خلیفہ فی الارض مقرر کرنے والا ہوں تو ملائکہ نے عرض کیا کہ کیا تو ایک ایسی ہستی کو جس میں فساد اور خونریزی پیدا کرنے کی جھلک نظر آتی ہے استخلاف ارض عطا کرنا چاہتا ہے، حالانکہ ہم تیری حمد میں زمزمہ سنج اور تیری تقدیس میں نغمہ بار رہتے ہیں؟

جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

> بیشک میں جانتا ہوں جو تمہارے حیطۂ علم میں نہیں۔ اور آدم کو علم الاشیاء سکھایا (اشیاء کو نام دے کر متمیز کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی)

ضمناً آدم کو نام دے کر اشیاء کو متمیز کرنے کی صلاحیت عطا کرنے کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی کہ ہر تصور اپنے اظہار کے لئے الفاظ کا محتاج ہے اور الفاظ بجائے خویش مخصوص تصورات کے حامل ہوتے ہیں۔ دونوں لازم ملزوم ہیں اور ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں کا بیک وقت تخلیق ہونا ناگزیر ہے۔ معمولی الفاظ سے جو معمولی تصورات کا جامہ ہوتے ہیں، پیچیدہ اور جامع تصورات معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ تصورات ایک فرد سے دوسرے فرد تک منتقل ہونے یا حافظہ میں محفوظ رہنے کے لئے الفاظ اور اسی نام دیئے جانے کی صلاحیت کے رہین منت ہیں۔ ڈاکٹر بک (Dr. Bucke) اپنی مشہور کتاب (Cosmic Consciousness) میں لکھتا ہے:

> عقلِ انسانی کا نمو تصورات کا نمو ہے۔ یعنی ایک طرف سادہ اور آسان تصورات کا اضافہ اور دوسری طرف ان کا پیچیدہ سے پیچیدہ تر اور جامع سے جامع تر صورت اختیار کرنا۔ ہر تصور کے لئے ایک لفظ

اور ہر لفظ کے لئے ایک تصور کی ضرورت ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر برقرار نہیں رہ سکتے۔ کوئی لفظ اس وقت تک معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ اس سے کسی تصور کا اظہار مقصود نہ ہو اور کوئی تصور بھی اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ کوئی جداگانہ لفظ اس کے مفہوم کو ظاہر نہ کر سکے۔

دورِ حاضر کے سائنسدان اپنے تجربات کی بنا پر ان حقائق کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں جو قرآن نے صدیوں پیشتر اس قدر بیّن اور صحیح طریقہ پر منکشف کر دیئے تھے۔

ازمنہ قدیم کے فلسفیوں اور ریاکار فقیہوں کے پیش کردہ باطل تصور اور عقیدہ "وہم" یا "مایا" کے برعکس قرآن نے پہلی بار صاف و صریح الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ خالقِ حقیقی نے تخلیقِ موجودات کو محض کھیل تماشے کی خاطر پیدا نہیں کیا، بلکہ اس عالمِ رنگ و بو سے ایک مقصدِ عظیم کی تکمیل مقصود ہے۔

> ہم نے ارض اور سموٰت کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے، محض کھیل کے لئے پیدا نہیں کیا۔ ہم نے ان کو حق کے ساتھ (یعنی ایک مثبت تعمیری مقصد کے لئے) پیدا کیا ہے لیکن اکثر انسان یہ نہیں سمجھتے۔ (۴۴/۳۸-۳۹)

قرآن کریم کی ان آیات میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ جو حوادث یا مظاہرِ قدرت نہ تو بلا سبب پیدا کئے گئے ہیں اور نہ ہی غیر حقیقی ہیں، ان کی تخلیق ایک نہایت اہم مقصد کی حامل ہے۔ زمین پر انسان کا مدتِ معینہ کے لئے عارضی قیام ایک تخلیقی مثبت مقصد کے لئے ہے۔ اور یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب کہ انسان کی دنیائے انفس یا داخلی دنیا اور حقیقت کے مشہود مظاہرِ فطرت میں باہمی توافق اور ہم آہنگی ہو۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ان حقائق کی تائید و وضاحت کی گئی ہے۔ میں صرف چند آیات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

> بیشک سطحِ زمین اور بلندیوں کی تخلیق میں اور لیل و نہار کے اختلاف میں سمجھدار لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے (ہر حال میں) اللہ (قوانینِ الٰہیہ) کو یاد رکھتے ہیں اور سطحِ زمین اور بلندیوں کی تخلیق کے بارے میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار (نشوونما دینے والے) تو نے یہ سب (کارخانۂ فطرت) بے وجہ پیدا نہیں کیا۔ (۳/۱۹۰-۱۹۱)

> بیشک سطحِ زمین اور بلندیوں کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے اختلاف میں اور سمندروں میں کشتیوں کے چلنے میں جن سے انسانوں کو نفع پہنچتا ہے اور بلندیوں سے بارش کے نزول میں جس سے خشک و مردہ زمین تر و تازہ ہوتی ہے (اور اس میں صلاحیتِ نمو پیدا ہوتی ہے) اور اس پر ہر قسم کے جانوروں کے ہونے میں اور ہواؤں کے چلنے میں اور زمین اور بلندیوں کے مابین معلق بادلوں میں سمجھدار قوموں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (۲/۱۶۴)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تاکہ بر و بحر کی تاریکیوں میں تمہیں راستہ ملے۔ ہم نے جاننے والے لوگوں کے لئے کیسی واضح نشانیاں بنائی ہیں! (۶/۹۷)

وہی ہے جس نے تم کو ایک نفسِ واحد سے بنایا اور تمہارے قیام اور ودائع کی جگہ مقرر کی۔ سمجھ دار لوگوں کے لئے ہم نے اپنی نشانیاں کیسی واضح بنائی ہیں! (۶/۹۸)

وہی ہے جس نے بلندی سے پانی اتارا اور اسکے ذریعے ہر قسم کی نباتات پیدا کی اور شگوفہ نکالا جس سے تہ بہ تہ دانہ دانہ نکلتا ہے۔ اور ہم نے کھجور کے گابھوں سے جھکے ہوئے خوشے نکالے اور انگور، زیتون اور انار کے باغ ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی اور مختلف بھی۔ (۶/۹۹)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرا پروردگار کس طرح سائے کو پھیلاتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اسے ساکن رکھتا لیکن ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔ پھر ہم کس آسانی سے آہستہ آہستہ سائے کو سکیڑ دیتے ہیں۔ (۲۵/۴۵-۴۶)

کیا وہ ابر کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کئے ہیں اور بلندیاں کیسے اٹھائی گئی ہیں اور پہاڑ کیسے نصب کئے گئے ہیں اور سطحِ زمین کیسے پھیلائی گئی ہے! (۸۸/۱۷-۲۰)

جس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے اس کارخانۂ عالم کی تخلیق ہوئی وہ محض علمِ اشیاء کے ودیعت کر دینے سے ہی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ اس مدعائے عظیم کی تکمیل کے لیئے یہ بھی لازم تھا کہ انسان کو فطرت کی ان قوتوں کو جو ارض و سموات کے مابین کارفرما ہیں مسخر کرنے اور انہیں مفید مطلب بنانے کی صلاحیت بھی ودیعت کی جاتی۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے:

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کو جو سطحِ زمین اور بلندیوں میں ہیں تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، اور وہ تمہارے ساتھ ان سب نعمتوں میں جو ظہور میں آ چکی ہیں یا بطنِ فطرت میں ہیں، فیاض ہے۔ (۳۱/۲۰)

اور اس نے دن اور رات کو اور سورج اور چاند کو تمہارا مطیع کر دیا ہے۔ اور تاروں کو بھی اپنے حکم سے تمہارا مطیع کر دیا ہے۔ بیشک اس میں سمجھدار لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں۔ (۱۶/۱۲)

مندرجہ صدر آیات کے محض سطحی مطالعہ سے بھی یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح بے نقاب ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم کے نزدیک "علم اور سمجھ والے لوگوں" سے کیا مراد ہے۔ وہ لوگ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے اور اپنے قبضۂ اقتدار میں لانے کی پیہم سعی اور جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں، اور انہیں مسخر کر کے اپنی داخلی قوتوں سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں اور پھر اس ماحصل کو ان بنیادی اور محکم قوانین کے مطابق بروئے کار لاتے ہیں جنہیں دنیائے انسانیت میں رائج و نافذ ہونا چاہیے۔ ایسے لوگ

قرآن مجید کی میزان میں علم اور سمجھ والے کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ یہی علماء ہیں۔ قرآن "مذہبیات" کا قائل نہیں اور علماء سے اس کی مراد وہ لوگ نہیں جو عام طور پر مولوی یا علمائے مذہب کہلائے جاتے ہیں۔ قرآن نہایت شدت سے مادی کائنات کی جانب توجہ مبذول کرانے کے بعد کہتا ہے:

> کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے بلندیوں سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے مختلف رنگ کے پھل اگائے اور پہاڑ بنائے جن میں سفید، سرخ اور دوسرے رنگوں کی دھاریاں ہیں اور سیاہ بھی؟ اور انسان، درندے اور چوپائے بھی اسی طرح مختلف رنگوں کے ہیں۔ (۳۵/۲۷-۲۸)

ان شعبہائے علم و تحقیق اور مظاہرِ فطرت کے قوانین کے تذکرہ کے بعد قرآن نے علماء یا اصحابِ علم کا ذکر کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو علومِ فطرت کی گہرائیوں میں جا کر خالقِ حقیقی کی عظمت کا ادراک حاصل کرتے ہیں (۳۵/۲۸)۔

وہ لوگ جو اپنے گرد و پیش کے مظاہرِ فطرت کے مشاہدہ سے بے خبر مُردوں کی طرح روئے زمین پر بار بن کر رہتے ہیں اور جنھیں اپنے ماحول کے ادراک کی خواہش تک نہیں ہوتی قرآن کے الفاظ میں انھیں جسمانی آنکھیں تو میسر ہیں مگر وہ بصیرت سے قطعاً محروم ہیں۔ (۲۲/۴۶) اور جو لوگ بصیرت سے عاری ہیں انھیں "اعمیٰ" (بے بصر) کہا گیا ہے جو اس دنیا میں بھی بے بصر ہیں اور آخرت میں بھی بے بصر ہی رہیں گے۔ (۱۷/۷۲)

قرآنِ کریم کی ان آیاتِ جلیلہ اور سطورِ بالا سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ اسلامی نظریے کے مطابق نجات کا انحصار باطنیت کی اس پُراسرار صورت پر نہیں جس سے انسان اپنے ہی خول کے اندر سمٹ کر رہ جائے۔ اس کے بجائے قرآن نے زور اس امر پر دیا ہے کہ انسان کی داخلی دنیا اور اس کی خارجی فطرت کی تسخیر میں ہم آہنگی لازمی ہے۔ اس ہم آہنگی سے وہ شجرِ طیب پھوٹے گا جو دنیا اور آخرت دونوں میں ثمر بار ہو گا۔ انسان کی طبیعی زندگی اور حیاتِ اُخروی کا تعلق کہیں منقطع نہیں ہوتا۔ یہ ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے جو اس زندگی میں تو زمان و مکان کی حدود میں محصور ہے لیکن اخروی زندگی میں ان جکڑ بندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور جب تک اس درخت کی مناسب آبیاری یہاں نہ کی جائے اس میں نشو و نما پانے اور دنیا اور آخرت میں برگ و بار لانے کی اہلیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

ایک ایسا نظامِ زندگی یا دینِ فطرت جو فطرت کے مطالعہ اور اس کی تسخیر کی ضرورت پر اس شدت سے زور دے اپنے پیروانِ حقیقی میں یقیناً ایسے لوگ پیدا کرنے کا ذمہ دار ہو گا جو اپنی عملی زندگی میں ذہنِ انسانی کی ترقی اور ارتقا کے اس طریقہ کا بین ثبوت دیں۔ امم اسلامیہ کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ بطورِ دلیلِ دعوےٰ میں ان کا اجمالی تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔

بدقسمتی سے مسلمانوں کی سائنسی ترقی کی تفصیلات کے لئے ہمیں جن مورخین اور مستشرقین کی تحقیقات کا دستِ نگر اور رہینِ منت ہونا پڑتا ہے ان کی اکثریت ان مغربی مسیحی مصنفین پر مشتمل ہے جن کے قلوب و اذہان پر ہر اسلامی چیز کے خلاف بغض اور تعصب کا غلبہ تھا۔ اس تعصب کی وجہ وہ رسوا کن شکستیں تھیں جو صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسیحی دنیا کو اٹھانا پڑیں۔ تاریخ صرف ایک ہی ایسا دور پیش کرتی ہے جبکہ ہمیں یورپ کی باہم دست و گریباں اقوام ایک محاذ پر متحد نظر آتی ہیں، اور یہ متحدہ محاذ ان مسلمان دشمنوں سے مسیحی دنیا کو بچانے کے لئے قائم ہوا تھا، وہ مسلمان جن کو "بے دین" اور "ملحد کتے" کے حقارت آمیز ناموں سے موسوم کرتی تھیں۔ ان کے ہاں صرف ایک جذبے کو پروان چڑھایا جاتا تھا اور وہ جذبہ یہ تھا کہ ہر اس چیز کو جس سے اسلام کا دور کا بھی واسطہ ہو شدید نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یہ جذبہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد بھی اقوامِ یورپ پر مسلط رہا حالانکہ صلیبی شکستیں ماضیٔ بعید کی دھندلی تاریخ کا فسانہ بن چکی تھیں۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد نو آبادیاتی سامراجیت کے دورِ بربریت تک بھی یہی جذبہ غالب اور کارفرما رہا۔

برفو (BRIFFAULT) اپنی کتاب "تشکیلِ انسانیت" (The Making of Humanity) میں لکھتا ہے: "ملحد کتے کا جو احسان یورپ پر ہے اس کے لئے مسیحی تصورِ تاریخ میں کوئی گنجائش نہیں اور یہی کتمان و تلبیس صداقت تمام تصورات ما بعد پر غالب رہا۔ گزشتہ صدی تک کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جس سے مسلمانوں کی تاریخ اور ان کی ثقافت کے متعلق قدرے صحیح علم حاصل ہو سکے۔ آج بھی یورپ کے ازمنہ بربریت سے نکلنے اور نشاۃ ثانیہ میں قدم رکھنے کی تاریخ میں عرب تہذیب کے حیات پرور اثر کا کوئی حوالہ نہیں دیا جا رہا۔ گویا کہ بغیر ہیملٹ کے ذکر کے شاہزادہ ڈنمارک کی تاریخ لکھی جا رہی ہے"

ابھی تھوڑے عرصہ سے یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ اقوام یورپ کے اذہان و قلوب سے مسلمانوں سے بے وجہ دشمنی کا جنون بتدریج اتر رہا ہے، اور مسلمان حملہ آوروں کی نسلوں سے پوری طرح انتقام لے چکنے کے بعد اب ان کا احساسِ کمتری دور ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ مسلمان ہی تھے جو ظلمات یورپ میں مشعلِ علم و ہنر لے کر پہنچے تھے اور اہلِ خطہ کو تہذیب و تمدن سے دوچار کیا تھا۔ چنانچہ اب کچھ عرصے سے مسیحانِ یورپ کا ذہن اس احسانِ عظیم کا معترف ہو رہا ہے جو اسلام نے ان پر کیا۔ مشہور مورخ تہذیب ڈارسی (Dorsey) رقمطراز ہے: "ہمارے لئے یہ کہنا زیادہ آسان ہے کہ اگر کوپرنیکس نہ ہوتا تو نیوٹن کا ظہور بھی نہ ہوتا بہ نسبت اس کے کہ اگر عربی علم ہیئت نہ ہوتا تو کوپرنیکس ہی نہ ہوتا۔ یا یہ کہنا بھی زیادہ سہل ہے کہ اگر یہودیت نہ ہوتی تو عیسائیت کا نام و نشان نہ ہوتا بہ نسبت اس کے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو موجودہ تہذیب ہی ناپید ہوتی۔"

سر آئیور ہارج نے بھی اپنی کتاب (Pioneers of Science) میں اسی حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "یہ عرب ہی تھے جنہوں نے قدیم نظریات اور موجودہ سائنس کے درمیان ایک مؤثر کڑی کا کام دیا۔ یورپ کا دورِ ظلمت سائنسی ترقی کی تاریخ میں ایک خلا ہے اور قریب ایک ہزار برس کے درمیانی وقفے میں سوائے عربوں کے کہیں کسی سائنسدان اور فلسفی کا وجود نظر نہیں آتا۔"

انیسویں صدی سے قبل یورپ کے مورخین و مستشرقین کے شائع کردہ وقائع اسلام کس قدر خرافات کا پلندہ اور غیر معتبر تھے، اس کا اندازہ پروفیسر بیون کے اس قول سے ہوتا ہے جو ان کی کتاب (Cambridge Medieval History) میں درج ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ "انیسویں صدی کے آغاز سے قبل محمدؐ اور اسلام کے جو حالات یورپ میں شائع ہوئے ان کی حقیقت "ادبی مہملات" سے زیادہ نہیں۔"

برفو نے جو جدید یورپی مفکرین میں متوازن شخصیت کی نمایاں مثال ہے، اسلام کے خلاف یورپی مسیحیت کی کوتاہ نظری اور کلیسائی تعصب سے بالاتر ہو کر بے لاگ صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ اس نے نہایت ایمانداری اور قابلِ قدر فراخدلی سے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اسلام کا ظہور تشکیلِ انسانیت میں ایک فیصلہ کن موڑ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی دورِ قدیم سے دورِ جدید میں داخل ہوتی ہے۔ دیانتدارانہ قدرشناسی اور بیباکانہ اظہارِ خیال کیلئے ہم برفو کے ممنون ہیں۔ اگر اس مقام پر ہم برفو سے ذرا تفصیلی اقتباس پیش کریں تو چنداں مضائقہ نہ ہوگا۔

> یورپ کی حقیقی نشاۃ ثانیہ پندرہویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ عربوں کے اور ہسپانوی مسلم ثقافت کے تجدیدی دور کی رہینِ منت ہے۔ اس نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ اطالیہ نہیں بلکہ ہسپانیہ تھا۔ یورپ بربریت کی اسفل ترین گہرائیوں میں گر کر جہالت اور ذلت کی تاریکیوں میں ڈوب چکا تھا جبکہ اسلامی دنیا کے شہر بغداد، قاہرہ، قرطبہ وغیرہ تہذیب و تمدن کی سرگرمیوں کے درخشندہ مرکز بن رہے تھے۔ اور وہیں اس حیات نو نے آنکھ کھولی جو بعد میں انسانی ارتقا کی ایک نئی شکل اختیار کرنے والی تھی۔ جونہی ان کی ثقافت یورپ پر اثر انداز ہوئی وہاں ایک نئی حرکت ظہور پذیر ہوئی۔
>
> آکسفورڈ کے مدرسۂ فکر میں انہی ہسپانوی مسلمانوں کے جانشینوں کے زیرِ ارشاد راجر بیکن نے عربی زبان اور عربی سائنس سے استفادہ کیا۔ تجرباتی طریقۂ کار سے یورپ کو متعارف کرانے کا سہرا تو راجر بیکن کے سر ہے نہ اس کے بعد کے ہم نام کے سر۔ راجر بیکن بھی یورپ میں مسلم سائنس اور تجرباتی طریقے کے مبلغین میں سے ایک تھا جس نے کبھی یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا کہ عربی زبان اور عربی سائنس ہی اس کے ہم عصروں کیلئے

حقیقی علم کا واحد ذریعہ تھے۔ یہ بحث کہ تجرباتی طریقہ کا بانی کون تھا وغیرہ وغیرہ۔ یورپی تہذیب و تمدن کے ماخذوں سے متعلق عظیم ترین غلط بیانیوں کے اجزا میں سے ہے۔ بیکن کے زمانہ تک عربوں کا تجرباتی طریقہ کار عام رواج پاچکا تھا اور سارے یورپ میں بڑی سرگرمی سے اس طریقۂ کار کا ذوق پیدا کیا جا رہا تھا۔

موجودہ تہذیب اس مہتم بالشان عطیہ یعنی سائنس کے لئے عرب تہذیب کی رہین منت ہے۔ البتہ اس عطیہ کے ثمرات بڑی مدت میں تیار ہوئے۔ ہسپانوی مسلمانوں کی ثقافت کے انحطاط کے بہت عرصے بعد اس غیر معمولی قدوقامت کے پودے نے پوری بالیدگی حاصل کی۔

نہ صرف سائنس ہی نے یورپ کو نئی زندگی عطا کی بلکہ اسلامی تہذیب کے گوناگوں اثرات نے بھی اس کی روح خوابیدہ کو گرمیٔ حیات بخشی۔

اگرچہ یورپ کے نمو میں کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس پر اسلامی ثقافت کا فیصلہ کن اثر نہ پایا جائے تاہم یہ امر قطعی ہے کہ اس کے دورِ جدید کی خصوصی قوت اور اس کی کامیابی کا راز یہی طبیعی سائنس اور سائنسی رجحانات ہیں جو اسے عربوں سے ورثہ میں ملے۔

ہماری سائنس پر عربوں کا احسان انقلاب انگیز و محیر العقول سائنسی نظریات و ایجادات نہیں بلکہ عرب ثقافت کا ہماری سائنس پر اس سے کہیں عظیم تر احسان ہے، کیونکہ خود اس کا وجود ہی ان کا مرہونِ تخلیق ہے۔ یونانیوں نے علم ہیئت اور علم ریاضی دوسرے ممالک سے مستعار لئے مگر ان علوم کو یونانی ثقافت کبھی بھی راس نہ آئی۔ انھوں نے ان علوم کو ترتیب دیا، استقرا بھی کیا اور نظریات بھی قائم کئے، مگر تحقیقِ علم کی تحقیق، سائنس کے دقیق طریقے، تفصیلی اور طولانی مشاہدے اور تجربات کے صبر آزما مراحل یونانی طبائع کی برداشت سے باہر تھے۔ . . . . جسے ہم سائنس کہتے ہیں اس کا آغاز یورپ میں تجسس کے ذوق، تحقیقات کے نئے اصولوں، تجربات کے انوکھے طریقوں، مشاہدوں اور ریاضی کی پیمائشوں پر مبنی تھا، جن سے یونانی محض ناواقف تھے اور جن سے یورپ کو عربوں نے متعارف کرایا۔

بہت ممکن ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو موجودہ یورپی تہذیب بھی وجود میں نہ آتی۔ یہ تو بالکل یقینی امر ہے کہ عربوں کے بغیر یورپی تہذیب کبھی وہ ہیئت اختیار نہ کر پاتی جو آج اسے ارتقا کی تمام سابقہ منزلوں پر فوقیت بخش رہی ہے۔

یہ ہیں بریفو کے تاثرات اس دور کے بارے میں جس کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک وجدانی کیفیت سے جھومتا ہے اور تشکیلِ انسانیت کے

اس باب کو ایک والہانہ انداز میں "دار الحکمت" کہہ کر متعارف کراتا ہے۔ بریفولٹ محققین میں سے ہے جنھوں نے سائنس کی دریافت اور تلاشِ حق کے لئے براہ راست عرب ماخذوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے عربوں اور دوران کی ثقافت کی بنیادی صحت مندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کا تذکرہ ہے جن کی ثقافت قرآن کی حیات بخش تعلیمات اور حقائق پر مبنی تھی جسے وہ لوگ نہ صرف سمجھتے ہی تھے بلکہ جس کی اطاعت ان کی عملی زندگی کا فریضہ تھا۔ ان لوگوں کی مشعلِ حیات اسلام کی سیدھی سادی اور روح پرور تعلیم توحید تھی جو مذہبیات، اساطیر اور روایات سے معری، رسوم سے پاک، پیشوائیت سے منزہ تھی کیونکہ وہ فقط دین پر مبنی تھی۔

یہاں سائنس کے ان اولین مسلمان محققین کا اجمالی ذکر بے محل نہ ہوگا جنھوں نے کلام مجید کی درخشاں و تابندہ مشعلِ راہ سے کسبِ نور کیا اور زمانۂ مابعد کو ضیائے علم سے منور کر دیا۔

جغرافیہ اور تجارت کے میدان میں سب سے پہلے خلیفہ المامون نے صحرائے شام میں طول بلد اور عرض بلد کی پیمائش کا حکم دیکر ستر علما کو محمد ابن موسیٰ کی سرکردگی میں اس کام پر مامور کیا۔ یہ تمام کرۂ ارض کی طول بلدی و عرض بلدی پیمائش کی ابتدا تھی۔ ان علما نے بیس برس کی محنتِ شاقہ کے بعد کرۂ ارض کا سب سے پہلا نقشہ تیار کیا۔ (۸۱۳-۸۳۳ عیسوی) عربوں کی یہ مساعی پانچ صدی بعد نویں صدی عیسوی کے آغاز میں کولمبس کی کوششوں کا پیش خیمہ بنیں جس نے تیرہ و تار سمندروں کی صعوبتوں کا مقابلہ اس یقینِ محکم سے کیا کہ کرۂ ارضی گول ہے، یونانیوں کے خیال کے مطابق طشتری کی طرح چپٹی نہیں۔ اس طرح ہندوستانی ساحلوں کی تلاش میں کولمبس کو براعظم امریکہ مل گیا جو آج مغربی تہذیب کا سب سے ترقی یافتہ علاقہ ہے۔ کولمبس نے جغرافیہ کا علم ایک عرب جہازراں سے سیکھا تھا۔ ۱۴۹۹ء میں واسکوڈی گاما جب براعظم افریقہ کا چکر کاٹ کر مشرقی افریقہ کے ساحلی مقام پہنچا تو ایک عرب ملاح (احمد ابن مجید) نے اس کو ہندوستان کا راستہ بتایا۔ پرتگیزی ماخذوں کے مطابق اسی ملاح کے پاس بہت اچھے بحری نقشے اور آلات تھے جن سے ہنوز یورپ کے جہازراں واقف نہ تھے۔ تاریخی شواہد گواہ ہیں کہ اس عرب ملاح نے بحرِ ہند، بحیرۂ قلزم، خلیج فارس، بحیرۂ چین اور مجمع الجزائر شرق الہند کے بارے میں جہازرانی کا ایک ضابطہ بھی تصنیف کیا تھا۔

المسعودی (۹۵۶ء) ایک مشہور عرب سیاح گزرا ہے جس نے اپنے سفر کے دوران میں علم جغرافیہ اور علم الاقوام سے متعلق نہایت اہم معلومات حاصل کیں اور متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے دو برطانوی عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔

دسویں صدی کے وسط میں عربوں کے جہاز چین کے شہر خنفو (موجودہ کینٹن) تک پہنچ چکے تھے۔ اس زمانہ میں اس شہر میں خاصی بڑی اسلامی نوآبادی تھی جو چین سے تجارت کی منڈی بنی ہوئی تھی۔ ان مسلمان تاجروں کی خوش معاملگی اور

دیانتداری کا فیض ہے کہ مبلغینِ اسلام جو کبھی تاجر تھے دور دراز مقامات تک پہنچے اور ان ممالک کی کثیر آبادی ان انسانیت کے علم برداروں کے حسنِ عمل کو دیکھ کر مشرف بہ اسلام ہوئی۔

گیارھویں صدی عیسوی میں البقری ایک ہسپانوی مصنف نے ضخیم کتابیں لکھیں جن میں ایشیا اور افریقہ کے ساحلی علاقوں اور بندرگاہوں کے راستوں کے متعلق وسیع معلومات ہیں۔

ابن جابر، ابن بطوطہ اور ابن فاطمہ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے مشہور سیاح اور واقعہ نگار ہیں۔

طب اور کیمیا کے میدان میں اسلامی سائنس کے مدفون خزائن اب نمودار ہو رہے ہیں۔ صرف قسطنطنیہ کی اسّی سے زیادہ مسجدوں کی لائبریریوں سے لاکھوں قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ قاہرہ، بغداد، دمشق، موصل اور تبریز ایران میں بھی بے بہا ذخائر ہیں جن میں سے بہت کم کی فہرستیں تیار ہوئیں جن سے امکان کا کا حقہ جائزہ لیا جا سکا ہو۔ اس وقت تک جو مواد ملا ہے وہ اسلام میں سائنس کی ابتدائی تاریخ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

یہ مسلمان عرب ہی تھے جنہوں نے اولاً اس موضوع سے متعلق جس قدر یونانی علوم سے مہیا ہو سکتا تھا مہیا کیا اور اسے اپنی زندہ زبان میں تراجم کی شکل میں محفوظ کر لیا۔ اگر یہ تراجم نہ کئے جاتے تو یہ سارا مواد ضائع ہو جاتا اور آج دنیا یونان کی ثقافت کی ابجد سے بھی نابلد ہوتی۔ یہ مواد جمع کر لینے کے بعد عربوں نے خود تحقیق شروع کی اور یونان کے فراہم کردہ نظریات کو تجربہ اور مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھ کر ان نظریات کی توثیق یا تردید کی۔ بغداد میں المامون نے باقاعدہ دارالترجمہ قائم کیا جس کا ایک نامور مترجم حنین ابن اسحٰق تھا۔ (۸۰۹ - ۸۷۷ء) حنین قابل فلسفی اور فاضل طبیب تھا جس نے جالینوس کی طبی اور فلسفیانہ تصانیف کا مکمل ترجمہ کیا۔ علاوہ اس کے اس نے ہپوقراطیس کے اشال (Oribasius) کے خاکوں اور پال (ساکن Aegina) کی سات کتابوں کا بھی ترجمہ کیا۔ حنین سے جو تراجم منسوب کئے جاتے ہیں ان میں دوسرے یونانی اطبا اور ماہرین حیوانات کی کتابیں اور ارسطو کی متعدد طبیعی تحریرات بھی شامل ہیں۔ خود حنین کی اپنی تصانیف بھی اتنی ہی کثیر التعداد ہیں جتنے کہ اس کے تراجم۔ امراضِ چشم کے علم سے متعلق پہلی معلوم دری کتاب اس کے دس رسائل چشم ہیں

تراجم سے قطع نظر اس زمانہ کی اصل تصنیفات ان مسلمانوں کی دقتِ نظر کی شاہد ہیں۔ طبعیات میں الکندی بہت مشہور سائنسدان ہو گزرا ہے جس سے کم و بیش ۲۶۵ نسخے منسوب کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے کم از کم پندرہ علم طبقات الارض پر مشتمل ہیں۔ بہت سی "اوزان" مدوجزر، بصریات اور خاص طور پر انعکاس نور پر ہیں۔ آٹھ کتابیں موسیقی اور علم صوت پر ہیں اس کی بصریات نے جو لاطینی زبان میں محفوظ ہے، راجر بیکن اور مغرب کے دوسرے سائنسدانوں کو متاثر کیا۔

اس زمانے کا ایک اور مشہور مصنف اور سائنسدان رازی تھا (۸۶۵ - ۹۲۵ء) یہ دنیائے اسلام کا سب سے

بڑا طبیب تھا۔ اور دنیا کے اطبا میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے اس کی سب سے بڑی اور جامع طبی تصنیف جواپنا ثانی نہیں رکھتی "الحاوی" ہے جس میں یونانی، سریانی اور ابتدائی عربی طب پورے کا پورا موجود ہے۔

اس کے بعد جابر کا ذکر نا گزیر ہے۔ یہ بابائے کیمیا کہلاتا ہے، اور قریب ایک سو نسخے جو اس سے منسوب ہیں اب بھی محفوظ ہیں۔ جابر نے عمل تبخیر، عمل کرشید و دیگر اعمالِ کیمیا کے نئے اور بہتر طریقے ایجاد کیے۔

اب ہم ابوعلی الحسین ابن سینا کی جانب آتے ہیں جو مغرب میں عام طور پر اوی سینا کے نام سے مشہور ہے۔ (۹۸۰-۱۰۳۷ء) اس کی معرکہ آرا تصنیف "القانون" عربی تنظیم و ترتیب کا معراج شاہکار ہے۔ اس طبی دائرۃ المعارف میں علم ادویہ، مفردات و مرکبات، اعضائے جسم انسانی کو متاثر کرنے والے امراض خصوصی علم تشخیص الامراض اور کتاب الادویہ پر نہایت محققانہ بحث کی گئی ہے۔ آج یورپ کی ایلوپیتھی کا ماخذ و منبع یہی بحث ہے جسے یورپ نے اپنا کر اپنی طبی افضلیت کا سکہ چار دانگ عالم پر بٹھایا ہوا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں اس کا ترجمہ لاطینی میں ہوا اور اس کتاب کی مانگ کا یہ عالم تھا کہ پندرہویں صدی عیسوی کے آخری تیس سال میں سولہ مرتبہ اور سولہویں صدی عیسوی میں بیس سے زائد مرتبہ اس کی اشاعت ہوئی۔ ان اعداد و شمار میں اس کے جزئی نسخے شامل نہیں۔ اس کے علاوہ ابن سینا نے پہاڑوں، پتھروں اور معدنیات پر بھی رسائل لکھے جنہیں تاریخ علم طبقات الارض میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے کہ اس میں زلزلوں، ہوا، حرارت، پانی کے ساتھ آنے والی مٹی کے جماؤ یا پیوست اور انجماد کے دوسرے اسباب سے بحث کی گئی ہے۔

اخوان الصفا۔ ایک خفیہ فلسفیانہ جماعت۔ نے چودہویں صدی عیسوی میں عراق میں قائم ہوئی، ایک دائرۃ المعارف مرتب کیا جو ۵۲ رسائل پر مشتمل ہے۔ ان میں سے سترہ میں طبیعی سائنس سے بحث کی گئی ہے اور معدنیات کی ہیئت، زلزلوں، مدوجزر، اور عناصر پر اجرام و اجسام سماوی کے تعلق اور اثر سے متعلق مباحث ہیں۔

مابعد کی صدیوں میں موسمیات کے مطالعہ اور بالخصوص اوزان میں مسلمانوں کی دلچسپی ترقی پذیر ہوتی رہی بسنہ ۱۲۰۶ء میں الجزری نے عراق میں (Mechanics) اور گھڑیوں پر ایک زبردست کتاب مکمل کی۔

"ریاضی کے معاملے میں" علامہ اقبال کے الفاظ میں "یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بطلیموس (۸۷-۱۶۵ء) کے زمانے سے لیکر نصیر طوسی (۱۲۰۱-۱۲۷۴ء) کے وقت تک کسی نے سنجیدگی سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش نہ کی کہ اقلیدس کا متوازی مفروضہ مشہود مکان (Perceptual Space) میں عملاً ثابت نہیں ہو سکتا۔ ریاضی کی دنیا میں جو جمود و تعطل ایک ہزار برس سے طاری تھا اسے دور کرنے والا پہلا شخص طوسی تھا۔"

البیرونی نے ریاضی سے متعلق کتاب میں کائنات کے سکونی تصور کی خامی کو خالص سائنسی نقطہ نظر سے دیکھکر

اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ یونانیوں کا یہ تصور بالکل باطل تھا۔ علامہ اقبال ہی کے الفاظ میں "یونانی تصور اعداد کا مفہوم خالص قدر سے خالص ربط میں اس وقت تبدیل ہوا جب خوارزمی حساب سے الجبرا کی جانب متوجہ ہوا۔ البیرونی نے ایک قطعی قدم اس جانب بڑھایا جسے (Spengler) سپنگلر Chronological Number کے نام سے موسوم کرتا ہے اور یہ بسر ذہن انسانی کو "ہے" Being سے "ہونے" Becoming کی طرف لے جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں علم ریاضی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمیں علم ارتقاء حیوانی بھی ہیئت پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔ پرندوں کی زندگی میں نقل مکانی سے جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کو سب سے پہلے جاحظ نے محسوس کیا۔ بعد میں ابن مسکویہ نے اس کو زیادہ قطعی نظریے کی صورت میں پیش کیا جو اس کی کتاب "الفوز الاصغر" میں موجود ہے۔ ابن مسکویہ کا تصور کہ زندگی ایک ارتقائی تحریک ہے اور البیرونی کا فطرت کے متعلق یہ نظریہ کہ وہ عالم وجود میں آنے کا عمل ہے، یہ دونوں تصورات ابن خلدون کی علمی میراث بنے۔ ابن خلدون دنیا کے نامور ترین مورخین میں سے ہے جس نے تاریخ کو پہلی مرتبہ سائنس کا درجہ عطا کیا۔ کیونکہ یہی ایک طریقہ تاریخ کے مطالعہ کا ہے جس سے تاریخ اقوام و ملل سے وہ مثبت نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں جن کی بنا پر ہم موجودہ حالات کا جائزہ لیکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری تحریکات کن نتائج کی حامل ہو سکتی ہیں، اور اس طرح ہم اپنی تقدیر کے خود صورت گر ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کو سائنس بنانے کا خیال اور رجحان براہ راست قرآن سے لیا گیا ہے۔ قرآن میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ انسانی مسائل کے ارتقائی رجحانات کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے خواہ وہ کسی زمانے سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں، تاریخی اسباب و نتائج اور ماحول کے تاثرات پر ہر وقت نظر اور محاسبہ رکھنا ضروری ہے۔

مندرجہ بالا تاریخی شواہد سے جنھیں نقل کرنے میں باوجود اجمال کے کسی حد تک طوالت ناگزیر ہے، یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے فطرت کی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بارے میں جس شدت سے زور دیا ہے اس کا مطلب محض ذہنی تعیش نہیں۔

آپ کے سامنے داخلی اور خارجی شہادات پیش کی جا چکی ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا منشا اور قرآن کریم پر عمل کرنے والوں کا طرز زندگی کیا تھا۔ مسلمانوں کے دور ترقی کی تاریخ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان سائنسدانوں نے محض ذہنی تعیش کی خاطر سائنس کی جانب اپنی توجہ مبذول نہیں کی تھی۔ بلکہ ان کے ارادے اور مقاصد صاف اور واضح تھے۔ یہ ارادے اور مقاصد اس کے سوا کچھ نہ تھے کہ قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی داخلی قوتوں کی تنظیم و ارتقا کے ساتھ ساتھ فطرت کی خارجی قوتوں کو ہم آہنگ کر کے ان کے تعامل اور امتزاج سے ان قوتوں پر

جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے مطیع زیرِفرمان کردی ہیں غلبہ حاصل کیا جائے اور پھر ان قوتوں کو تعمیری اور مثبت منشاء ایزدی کے ماتحت بروئے کار لاکر انسانیت کے ارتقاء کے لئے استعمال کیا جائے جس سے انسان مادی دنیا پر راکب ہو کر الٰی وجہ ربلث پرواز Cosmic Consciousness شروع کردے اور ارتقائی زندگی کی اس آئندہ منزل کے لئے اپنے آپ کو منظم اور منضبط کرلے جو بدیہی طور پر کائناتی شعور کے حدود میں ہے۔ یہ زندگی ایک عملی تجربہ گاہ ہے جہاں انسان کا آخری تزکیہ ہوتا ہے۔ اس تزکیے کے بعد ہی انسان اخروی زندگی کے قابل ہوسکتا ہے، وہ زندگی جو زمان ومکان کی قیود سے ماوراء ہے اور تغیر وتبدل کے عناصر سے مبرا۔ وہ انسان کی ابدی شعوری زندگی ہے۔ اس میں باطنیت کے منتہائے حیات کی طرح نفی ذات وفنائے خودی نہیں۔

وہ قیمتی ورثہ جو اسلام نے اس دنیا کو دیا دو حصوں میں منقسم ہو چکا معلوم ہوتا ہے۔ ایک بڑا حصہ یعنی خالص سائنسی ارتقاء اقوامِ مغرب نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا ہے۔ مشرق اپنی ذہنی قلابازیوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم حقیقت کے دونوں پہلوؤں یعنی انفس وآفاق میں ہم آہنگی پیدا کریں جو ہمہ گیر بنیادی اقدار پر استوار ہوں۔ آج یورپ اپنی سائنسی ترقی میں Nuclear physics تک پہنچ چکا ہے۔ ایٹم بم ہائیڈروجن بم اور اب اس کے ساتھ کا بم نے انسانیت کو دہشت زدہ اور لرزہ براندام کرنا شروع کردیا ہے۔ بیشتر سائنسی ترقیات منفی سمتوں کی طرف جارہی ہیں۔ مثبت اور تخلیقی سمتوں میں فکر اور تجربہ سے بے پناہ کام ہوسکتا ہے۔ جن لوگوں کو قرآن کے مطالعہ سے استفادہ کی توفیق حاصل ہے انھیں بے شمار مثبت نشانیاں مل سکتی ہیں جو انھیں صحیح منزل کی جانب لے جاسکتی ہیں۔ محض ذہنی اٹھک بیٹھک ہی کافی نہیں ہمیں ان تمام لامحدود قوتوں سے جو فیاض فطرت نے فضائے بسیط میں ہمارے لئے بکھیر دی ہیں استفادہ کرنے کیلئے ان پر پوری طرح قابو پانے کا عزمِ مصمم کرنا ہوگا۔ مثبت اور صحیح نوعیت کی سائنسی تحقیق اور اس کے ساتھ ہی مستقل تجرباتی اور عملی جانچ پڑتال کے علاوہ فنی معلومات کا حصول ہمارے نوجوانوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔ یہ امر ہر وقت پیشِ نظر رہے کہ مغرب نے جس مقام پر دھوکا کھایا ہے وہ ان کا وہ غلط اور باطل نظریہ ہے جہاں انھوں نے محسوس کائنات پر غلبہ سے استفادہ کرنے میں اپنے آپ کو بنیادی قدروں کے تابع نہیں رکھا۔ اگر ہم توحیدِ الٰہی لہٰذا توحیدِ انسانیت پر غیر متزلزل ایمان کے ساتھ آگے بڑھیں اور جمیع بنی نوعِ انسان کے مفاد کی خاطر اپنی کوششوں کو استعمال کریں تو ہمیں تسخیرِ کائنات کا ایک وسیع میدان نظر آئے گا۔ اس طرح ہم اپنی گم گشتہ امامت نوعِ انسانی کو پھر سے حاصل کرسکیں گے اور مقصودِ حیات — الیٰ ربلث منتھٰھا (۴۲ ؍ ۵۳) کی تکمیل میں امکان بھر ساعی ہوسکیں گے

(بقیہ رفتارِ عالم از صفحہ ۲۴)

کیونکہ ایچی سن کے الفاظ میں "روسی سامراج کے ڈھانچہ میں نہ قومی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے نہ جمہوری ارتقاء کی گنجائش ہے"
برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے بھی اسی روز کہا:

> حالیہ مذاکرات لندن میں بعض ان ممالک کے متعلق بھی سوچ بچار کیا گیا جو شمالی اوقیانوس کی کونسل میں شامل نہیں، مثلاً یونان، ترکی اور ایران، ان ممالک کے تحفظ سے ہمیں خاص دلچسپی ہے۔ برطانیہ ان ممالک کو براہ راست امداد دیتا رہے گا جو اپنی آزادی کو بچانے کی خاطر جدوجہد کر رہے ہیں۔

صلح کا مشن

چینی نمائندے کی موجودگی کے خلاف روس نے اقوام متحدہ کا جو احتجاجی مقاطعہ کر رکھا ہے وہ جاری ہے۔ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل، مسٹر ٹریگوے لی، نے اکابر اقوام کے قائدین سے ذاتی ملاقاتوں کے لئے ایک وسیع دورہ شروع کیا تاکہ اقوام متحدہ کے اس تعطل کو دور کیا جا سکے۔ ۸ر مئی کو انھوں نے ماسکو جاتے ہوئے جینوا میں اپیل کی کہ "ٹھنڈی جنگ" اسی سال ختم کرنے کیلئے پوری کوشش کی جائے۔ ۱۱ر مئی کو وہ ماسکو پہنچے۔ دوسرے روسی حکام کے علاوہ ۱۵ر مئی کو انھوں نے سٹالین سے بھی ملاقات کی۔ ۱۹ر مئی کو ماسکو سے واپسی پر انھوں نے بتایا کہ سٹالین اور دوسرے روسی حکام کے ساتھ مذاکرات مصالحت کے نتائج میں غور و فکر کا بہت سامان ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق مسٹر لی سٹالین کا ایک "اہم پیغام" لے کر واپس آ رہے ہیں۔ مسٹر لی اب فرانسیسی اور برطانوی لیڈروں اور آخر میں صدر ٹرومین اور ڈین ایچی سن سے ملاقات کریں گے تاکہ اقوام متحدہ کے تعطل کو دور کیا جا سکے اور "ٹھنڈی جنگ" کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی جائے۔

پچیس سال تک بے لوث ادبی خدمت کے بعد مشہور علمی و ادبی ماہنامہ

نیرنگِ خیال

کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے۔ اس جوبلی سالنامہ میں مشہور اہل قلم کے اچھوتے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ علم و ادب کا یہ لاجواب ذخیرہ اڑھائی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ پرچہ ہر لحاظ سے مصور ہے۔ قیمت خاص جوبلی سالنامہ کی اڑھائی روپے سال بھر کیلئے خریدار بن جانے والوں کو صرف ساڑھے چھ روپے میں ملے گا۔ ہر ماہ ۸۰ صفحہ کا رسالہ شائع ہوتا ہے۔ رسالہ پابندی اوقات سے ہر ماہ کی ۲ر تاریخ کو راولپنڈی سے پوسٹ ہو جاتا ہے۔

منیجر نیرنگ خیال ۔ راولپنڈی

ریڈ کراس

ذرا تو سوچ مسلمانِ ملکِ پاکستان
کہ آج نسبتِ دیں بھی ترے نصیب میں ہے
یہ کیا کہ تجھ پہ مسلط ہے ریڈ کراس اب تک
جو کارِ خیر بھی ہے سایۂ صلیب میں ہے

فریبِ نفس ہے یہ کارِ خیر و خدمتِ خلق
تری فلاح کا موجب شعارِ غیر کہاں
ترے لئے ہے فقط دیں سے خیر و شر کی تمیز
نہ ہو جو دیں سے تعلق تو کارِ خیر کہاں

عیاں ہے نسبتِ حق کا اثر ذبیحے میں
یہاں درست خدا ہی کا نام ہوتا ہے
جو وقتِ ذبح لیا جائے نامِ غیر اللہ
حلال جانور اس سے حرام ہوتا ہے

کسی کے زخم کا مرہم کسی کے دکھ کی دوا
ہر ایک قوم یہ کارِ ثواب کرتی ہے
یہ کام خوب ہیں لیکن نگاہِ مسلم میں
انھیں صلیب کی نسبت خراب کرتی ہے

اسد ملتانی

باب المراسلات

اسبابِ زوالِ امت

(پرویز)

"اسبابِ زوالِ امت" کے عنوان سے جو میرا مضمون طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے عام طور پر ذہنوں کو سوچنے پر آمادہ بلکہ مجبور کیا۔ وہ ذہن جو انہی خطوط پر سوچتے تھے انھیں اس ہم آہنگی سے بڑی تقویت ملی اور ان کی وہ گھبراہٹ رفع ہوئی جسے وہ اپنے آپ کو تنہا پا کر ہمیشہ محسوس کیا کرتے تھے۔ جن سوچنے والوں نے ان خیالات کو اپنے سامنے پہلی مرتبہ کھڑا پایا وہ ابتداءً کچھ متوحش سے ہوئے لیکن مزید غور و فکر کے بعد ان کے ذہن نے ان کی تصویب اور ان کے قلب نے ان کی تصدیق کی۔ ان میں سے بہت سے حضرات نے اکثر اجمالی اشارات کی تفصیل چاہی اور کئی ایک مقامات پر اعتراضات بھی کئے۔ انھیں ان باتوں کا فرداً فرداً جواب دیا گیا اور یہ سلسلۂ افہام و تفہیم ان کے لئے وجہ تشفی ثابت ہوا۔

ان کے ساتھ ہی وہ طبقہ بھی خاموش نہ رہا جو ہمیشہ اپنی شکست خوردہ ذہنیت کی تسکین فریقِ مخالف کو گالیاں دینے سے کر لیتا ہے۔

جن حضرات نے بعض مجمل مقامات کی تفصیل چاہی تھی ان میں سے دو چار مقامات ایسے ہیں جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ ان کی وضاحت قارئین طلوعِ اسلام کے سامنے بھی پیش کر دوں تاکہ اس کا استفادہ عام ہو جائے۔ ان مقامات کو سطور ذیل میں سوالات اور جوابات کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی صاحب کسی اور مقام کی بھی وضاحت چاہتے ہوں تو مجھے مطلع فرمائیں۔

سوال (۱) آپ نے انسان کی مادی ضروریات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کی روحانی ضروریات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ اسلام کا منتہیٰ انسان کی معاشی زندگی میں توازن پیدا کرنا ہے؟

جواب ۔ انسان کی معاشی ضروریات سے مراد صرف روٹی کپڑا نہیں بلکہ وہ تمام اسباب و ذرائع ہیں جن سے انسان کے

مضمر جوہروں کو کامل نشوونما کا موقع ملے، یعنی انسان کے اندر جسقدر عمدہ صلاحیتیں ہیں ان تمام صلاحیتوں کے تکمیل پانے اور برومند ہونے کے لئے مواقع میسر ہوں، معاشی توازن سے یہی مراد ہے اور میرے نزدیک اسلام کا یہی منشا ہے۔ کیا کسی نظام کا یہ کارنامہ کم معرکہ آرا، محیرالعقول اور قابلِ فخر و ناز ہے کہ وہ اس قسم کا معاشی توازن قائم کر دے! اور اس نظام کا قیام کسی ایک خطۂ زمین یا انسانوں کے کسی ایک گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ اس کا دائرۂ عمل و نفوذ تمام دنیا کے انسانوں کو محیط ہو! حقیقت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک معاشی مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشی ضروریات کی اہمیت سے بھی انکار کرتے رہتے ہیں۔ یہ انکار درصل غمازی کرتا ہے مادی زندگی کے متعلق اس تصور کی جو عیسائیت کی رہبانیت اور عجمی تصوف نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کر رکھا ہے جس کی رو سے ہم مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ مادی زندگی اور اس کے تقاضے کوئی ایسی شے نہیں کہ جن کے تمسک سے ہم جھینپے جھینپے محسوس کریں۔ عملاً ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا روحانیت کا دعویدار بھی تھوڑی تک مادی دنیا کی ضروریات میں غرق ہوتا ہے۔ اور زبان سے ہم میں سے ہر شخص مادی دنیا پر لعنت بھیجتا ہے۔ اسلام اس قسم کی جھجک اور جھینپ کی زندگی کو منافقت کی زندگی قرار دیتا ہے جو سینوں میں ہر وقت ایک کشمکش پیدا کئے رکھتی ہے۔ وہ حقائق کا بے نقاب سامنا کرتا ہے اور ہر حقیقت کا مردانہ وار اعتراف کرتا ہے۔ وہ معاشی خوشگواریوں کو خدا کی نعمتیں قرار دیتا ہے اس کے نزدیک قابلِ نفرت معاشی خوشگواریوں کا حصول نہیں بلکہ وہ نظام ہے جو اس قسم کی معاشی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی کا بیشتر حصہ اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم رہ جاتا ہے، چہ جائیکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے اسباب و ذرائع ہر قدم پر موجود پائے۔ قرآن کے نزدیک انسانی حسنِ عمل کا تقاضا ہے کہ وہ اس قسم کے فساد انگیز یعنی ناہموار معاشی نظام کو مٹا کر اس کی جگہ عدل اور احسان کا متوازن معاشی نظام قائم کرے۔ جس نظام کا مقصود و منتہا یہ ہو کیا آپ کے نزدیک وہ نظام کچھ اہمیت نہیں رکھتا؟ اس نظام کے قیام اور قیام کے بعد بقا و استحکام کے لئے انسان کو جس قسم کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور "روحانیت" بھی ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لفظِ "ثواب" کی طرح "روحانیت" بھی ایک ایسا لفظ ہے جو آج تک کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا۔ بولنے کو ہر شخص یہ لفظ بولے گا لیکن پوچھنے پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ اس لفظ سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ وہ بہت دور کی کوڑی لائے گا تو کسی بزرگ کی کرامات گنا دیگا لیکن ان سے بھی بڑھ کر کرامات ہندو سنیاسیوں اور یوگیوں کی سننے اور دیکھنے میں آجائیں گی۔ قرآن نے کہیں بھی روحانیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کا مطالبہ ربانی بننے کا ہے اور اس کے معنی نشوونما دینے والے نظام کے حاملین کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس وقت تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ نظامِ عدل و

احسان اس قدر روحانیت پرور ماحول پیدا کر دے گا جس میں ہر انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے بروئے کار ہونے کے مواقع کیساں طور پر موجود پائے گا۔ یہی وہ ماحول ہوگا جس میں زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہی وہ ماحول تھا جس کی ایک جھلک آسمان کی آنکھ نے سرزمین عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر دیکھی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کی تمنا میں وہ آج تک سرگرداں پھر رہا ہے۔

سوال ۲:۔ آپ نے لکھا ہے کہ

(۱) جو قوم اپنی کوششوں کو کائنات کے قانون سے ہم آہنگ کرتی ہے اس کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں اور

(۲) اور جو قوم صرف اپنے لئے نہیں بلکہ آنیوالی نسلوں کے لئے بھی سوچتی ہو اس کی 'آخرت' بہتر ہو جاتی ہے۔

یورپ کی قومیں تسخیر فطرت بھی کر رہی ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے غلبہ و تسلط کی فکر بھی کرتی رہتی ہیں۔ تو کیا آپ بھی علامہ مشرقی کی طرح یورپ کی اقوام کو بہترین مومن قرار دیتے ہیں؟

جواب ۲:۔ جی نہیں! میں یورپ کی اقوام کو 'مومن' قرار نہیں دیتا! اگر آپ میرے مضمون کے دوسرے مقامات کو بھی ساتھ ملا کر دیکھتے تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ میں نے اقوام یورپ کے متعلق واضح طور پر لکھا ہے کہ

گروہ اول:۔ وہ لوگ جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اور مستقبل کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کے لئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے انھیں پیش پا افتادہ مفاد حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفار کا گروہ کہہ لیجئے جو مستقبل سے یکسر منکر ہے۔ آج اقوام مغرب اسی گروہ سے متعلق ہیں۔

اس سے ذرا آگے چل کر لکھا ہے،

بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کو مذہب چھوڑنا ہوگا۔ مذہب چھوڑنے کے بعد ان کے سامنے دو راستے ہوں گے۔ یا تو یہ بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اپنا مقصود و مدعا فقط قریبی مفاد (دنیا) قرار دے لیں۔ اس کے حصول میں پھر کوئی جھجک ان کے عنان گیر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد جو حشر اقوام عالم کا ہوگا وہی ان کا ہو جائے گا۔

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ میں یورپ کی اقوام کو مومن اور متقی قرار نہیں دیتا بلکہ ان کا شمار ان میں کرتا ہوں جو آخرت کے منکر ہیں۔ ایک تو ان کے پیش نظر نوع انسانی کا مشترکہ مفاد نہیں بلکہ اپنی اپنی گروہ بندیوں کا مفاد ہے اور دوسرے وہ ظہور نتائج اعمال کے لئے حیات بعد الممات کے قائل نہیں جس کی وجہ سے وہ انسان کی موجودہ زندگی کو سلسلہ ارتقاء کی

آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس قسم کا متوازن معاشی نظام قائم ہی نہیں کر سکتے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

میں نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی کوششوں کو کائناتی قوانین سے ہم آہنگ کرے گا اس کی کوششیں نتیجہ خیز اور بارآور ہوں گی۔ پانی کے لئے قانونِ کائنات یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جو کسان اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنائے گا اس کا کھیت سیراب ہوگا۔ جو پانی کی سطح سے اونچا بنائے گا پانی از خود وہاں تک نہیں پہنچ سکیگا۔ فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لانے کا یہی طریق ہے۔ جو قوم تسخیرِ فطرت کرے گی اس کی کوششیں بارآور ہوں گی۔ اقوامِ مغرب اس نہج سے مسلمانوں سے آگے ہیں کہ وہ فطرت کے دبے ہوئے خزانوں کو کھود کھود کر باہر نکال رہی ہیں اور ان سے دھڑا دھڑ متمتع ہو رہی ہیں۔ انھیں مفادِ عاجلہ (دنیاوی نعماء) نصیب ہیں۔ ہم ان سے محروم ہیں۔ صرف اس حد تک ان کی کوششیں کائناتی قانون سے ہم آہنگ ہیں۔ ہماری کوششیں اتنی بھی ہم آہنگ نہیں۔

جنھیں مفادِ عاجلہ نصیب ہیں، زندگی اور اس کی حرارتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ سمجھنا فریبِ نفس ہے کہ اگر مفادِ عاجلہ نصیب نہیں تو نہ ہوں۔ ہماری آخرت تو خوشگوار ہے ہی! جنھیں مفادِ عاجلہ میسر ہیں ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو صرف مفادِ عاجلہ ہی کو مقصودِ زندگی سمجھتے ہیں اور انسانیت کے مستقبل سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس غیر متوازن نظامِ زندگی کے قیام کے ذمہ دار ہیں جس کی بساط آج ہر طرف بچھ رہی ہے۔ ان کا حال روشن ہے۔ لیکن مستقبل تاریک۔ یہ بہر حال ان سے بہتر ہیں جن کا حال تاریک ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو مفادِ عاجلہ کے حصول کی جد و جہد کے ساتھ ساتھ انسانیت کے مستقبل پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کا حال بھی درخشندہ ہے اور مستقبل بھی تابناک۔ یہ گروہ، پہلے گروہ سے بہتر ہے جن کا صرف حال ہی روشن ہے۔ یہ ہے وہ گروہ جو اس قسم کے متوازن معاشی نظام کے قیام کا کفیل ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ نظام صرف اسی گروہ کے ہاتھوں قیام پذیر ہو سکتا ہے جو وحدتِ انسانیت اور وحدتِ حیات پر ایمان رکھتا ہو۔ قرآن اس نظام کے قیام کا عملی طریقہ بتاتا ہے، جس کا نام تقویٰ ہے۔ یعنی مفادِ عاجلہ کے لئے اپنی کوششوں کو قانونِ کائنات سے ہم آہنگ کرنا اور کوششوں کے ماحصل کو مستقل اقدار (وحی) سے ہم آہنگ کر کے ایسے ماحول کا قیام جس میں انسانیت بڑھے، پھولے اور پھلے۔

سوال ۳۳۔ آپ نے لکھا ہے کہ اسلام ایک معاشی نظام قائم کرتا ہے۔ روس کی اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایک بہترین معاشی نظام قائم کرتی ہے۔ اس نے ایک حد تک اس نظام کو عملاً قائم کر کے بھی دکھا دیا ہے۔ پھر اسلام اور اشتراکیت میں کیا فرق ہے؟

جواب ۳۳۔ اول تو اشتراکیت کے معاشی نظام اور اسلام کے معاشی نظام میں بہ حیثیت نظام کے بڑا فرق ہے۔ اشتراکیت کے

نظام کی بنیاد مساواتِ شکم پر ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ ربوبیت ایک ایسا متوازن ماحول پیدا کرتا ہے جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پانے اور بہرہ مند ہونے کے پورے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں۔

لیکن اصل فرق اس نہج و اسلوب اور اس کے نتائج و عواقب میں ہے جس سے اشتراکیت اور اسلام اپنا اپنا نظام قائم کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر (سلیم کے نام دو خطوط میں) لکھ چکا ہوں، اشتراکیت کا تصورِ حیات یکسر مادی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اشتراکی موت کے بعد، تسلسلِ حیات کا قائل نہیں۔ نہ ہی وحدتِ انسانیت کا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جس کی بنا پر اشتراکیین اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے اس لئے ان کے سامنے مفادِ عاجلہ کے سوا اور مفاد آ ہی نہیں سکتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نوعِ انسان سے ہمدردی کا جذبہ وہ قوتِ محرکہ ہے جس کی بنا پر وہ اس قسم کا عالمگیر نظامِ معیشت قائم کرنے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہیں لیکن یہ جذبہ تو اخلاقی قدر کے ماتحت آتا ہے اور مادی نظریۂ حیات میں اخلاقی اقدار کا تصور بار ہی نہیں پا سکتا۔ اس لئے اس قسم کا نظام یا تو ہنگامی جذبات کے ماتحت قائم کرایا جاسکتا ہے یا پھر استبداداً۔ اس وقت اشتراکی عوام کو محض سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبۂ انتقام کی بنا پر مشتعل کیا جاتا ہے اور یہی جذبہ ان کے اس "جنون" کا ذمہ دار ہے جو ان کی مساعی میں اس قدر گرمجوشی پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس قسم کے منفیانہ جذبات پر کسی تعمیری انقلاب کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب یہ مشتعل انتقامی جذبات فرو ہو جائیں گے تو پھر اس نظام کے قیام کا کوئی سہارا باقی نہیں رہیگا۔ اس وقت اس نئے نظام کے اربابِ حل و عقد اپنی قیادت و سیادت بلکہ اقوامِ عالم میں اپنی امامت کے تحفظ و بقا کی خاطر، عوام سے اس طرح میکانکی طور پر اس نظام کے قیام کے لئے کام لیں گے جس طرح ہر دوسرے نظام میں مستبد طبقہ نچلے طبقہ سے کام لیتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام جس متوازن نظامِ ربوبیت کا قیام چاہتا ہے اس کی بنیاد وحدتِ انسانیت اور تسلسلِ حیات کے غیر متزلزل عقیدہ پر رکھتا ہے (توحیدِ خداوندی پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی قانون نافذ العمل ہے جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر حاوی ہے اور جس کے اثر و نفوذ کا دائرہ طبیعی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہتا ہے) اس عقیدہ کی بنیادوں پر وہ ایک عملی پروگرام کی عمارت اٹھاتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پروگرام میں شریک ہونے والے کی اپنی ذات میں ایک تغیر واقعہ ہوتا جاتا ہے۔ اس نفسیاتی تغیر کا نام تعمیرِ سیرت یا استحکامِ ذات ہے۔ داخلی طور پر نفسِ انسانی میں یہ تغیر رونما ہوتا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں وہ نظامِ ربوبیت وجود کوش ہوتا چلا جاتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لہٰذا اس پروگرام کی رو سے انسان کی داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں

میں ربوبیت کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ عربی لغت کی رو سے ربوبیت (تربیت) کے معنی وہ طریق نشوونما ہے جس سے آہستہ آہستہ تدریجاً پانی کا قطرہ آغوشِ صدف میں گوہر بن جاتا ہے۔ اس استحکامِ ذات سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کرلیتا ہے اور موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کردیتی۔ اس نظام کی اطاعت کرانا اور استبداداً نہیں کرائی جاتی بلکہ یہ رضاکارانہ خواہشِ نفسِ انسانی کی گہرائیوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے، یعنی اس کی فطری خواہش بن جاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ اطاعت اس نظامِ ربوبیت کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ جب کھجور پک کر خود بخود شاخ سے الگ ہو کر نیچے ٹپک پڑے تو اس کی یہ کیفیت اطاعت کہلاتی ہے۔ اس لئے اسلام کے نظامِ ربوبیت میں ہر تربیت یافتہ نفس (یعنی جس نفسِ انسانی کی نشوونما اس نظامِ ربوبیت کی رو سے ہوگی) اس نظام کی اطاعت (بلکہ یوں کہئے کہ اس کے قیام واستحکام کے لئے جدوجہد میں شرکت) کا جذبہ اپنی ذات میں ابلتا ہوا پائے گا۔ اسلام کے متوازن معاشی نظام سے مراد اس قسم کا نظامِ ربوبیت ہے۔ نہ کہ محض روٹی کے مسئلہ کا حل اور ایسا حل جو مقصود بالذات بن کر رہ جائے کہ جب یہ مسئلہ حل ہو جائے تو اس کے بعد انسانی نشوونما وارتقاء کے میدان بھی ختم ہو جائیں اور اس لئے اس کی سعی وعمل کے محرکات کے چشمے بھی سوکھ جائیں۔

سوال عـ۲۔ آپ نے لکھا ہے کہ دین نے قیامِ صلوٰۃ کا حکم دیا تھا۔ مذہب میں یہ چیز نماز پڑھنے کے مرادف بن گئی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ دین میں صلوٰۃ کی کوئی اور شکل ہوگی۔ وہ کونسی شکل ہوگی؟ آپ کس قسم کی نماز پڑھتے ہیں؟

جواب عـ۲۔ دین نے اس نظامِ ربوبیت کی تشکیل اور قیام کے لئے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ایک پروگرام مرتب کیا ہے۔ صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج وغیرہ اسی پروگرام کے اجزاء ہیں۔ یہ پروگرام اس جماعت کی ساری زندگی کو محیط ہوتا ہے جو اس نظام کے قیام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ کبھی غیر مرئی شکل میں جبکہ اس کی روح اس جماعت کی زندگی کی سانس بن جاتی ہے اور کبھی مرئی اور محسوس صورت میں۔ اس پروگرام کی مرئی اور محسوس صورت کا نام "ارکانِ دین" ہیں۔ مذہب میں ان کی یہ مرئی اور محسوس صورت تو قائم رہتی ہے لیکن محض ایک رسم بن کر جس کا تعلق زندگی اور اس کے حوائج سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب یہ ارکان نظامِ ربوبیت کو متشکل کر رہے ہوں تو یہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور جب یہ محض رسمی طور پر ادا کئے جاتے ہوں تو ان کے متعلق تصور کر لیا جاتا ہے کہ یہ "انفرادی نجاتِ اخروی" کا موجب ہیں۔ یہ ہے مفہوم میرے اس بیان کا کہ دین میں اقامتِ صلوٰۃ، محض نماز پڑھنے تک محدود ہو جاتی ہے۔ سوال شکل وصورت کا نہیں، نتائج کا ہے۔ ان ارکان کی شکل و صورت تو دین میں بھی یہی رہے گی لیکن اس وقت یہ دین کی زندہ اور متحرک مشینری کے پرزے ہونے کی جہت سے تابندہ نتائج کے حامل ہوں گے۔ آج یہ پرزے اس مشینری کے اندر فٹ ہونے کے بجائے الگ الگ پڑے ہیں۔ اس لئے کوئی نتیجہ پیدا

نہیں کر رہے ۔ یہ ارکان کس طرح نظام ربوبیت کی تشکیل و بقا کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ارکان کا فطری اور یقینی نتیجہ اس نظام ربوبیت کا قیام ہے جس میں نوع انسانی توازن بدوش معاشی نظم و ترتیب کی سازگار فضاؤں میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے گی یوم یقوم الناس لرب العالمین۔

لہٰذا میرا یا کسی اور کا، کسی اور شکل و صورت کی نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بھی اسی شکل و صورت کی نماز پڑھتا ہوں جس کی اور مسلمان پڑھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو یہ دھوکا نہیں دیتا کہ قرآن کا مقصود یہی صلوٰۃ ہے جس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔

اس مقام پر پوچھا جا سکتا ہے کہ جب تم سمجھتے ہو کہ قرآن کا مقصود اس قسم کی بے نتیجہ نماز نہیں تو پھر تم نماز پڑھتے ہی کیوں ہو؟ اول تو اس لئے کہ قیام صلوٰۃ (یعنی دین کی صلوٰۃ کا قیام) ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک اجتماعی پروگرام ہے۔ لہٰذا جب تک اس رسمی نماز کی جگہ حقیقی صلوٰۃ کے قیام کا امکان نظر نہیں آتا، میں بھی باقی قوم کے ساتھ چلے جا رہا ہوں کہ بالآخر میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ البتہ میں اس امید کے سہارے یہ کچھ کرتا ہوں کہ جس وقت بھی ہمارے مقدر کا ستارہ پلٹا تو دین کے نظام ربوبیت کے لئے انہی بے جان ڈھانچوں میں روح پھونکی جائے گی کہ قیامت، نفخ صور ہی سے بپا ہوگی۔ میں اسلام کے مستقبل سے ناامید نہیں ہوں۔ بلکہ دنیا کا مستقبل اسی کے ساتھ وابستہ سمجھتا ہوں۔

اس میں شبہ نہیں کہ میں اس پروگرام کی ان جزئیات کو جو قرآن نے متعین نہیں کیں، غیر متبدل نہیں سمجھتا لیکن ان میں تغیر و تبدل کا حق بھی کسی فرد کو نہیں۔ نہ مجھے نہ کسی اور کو۔ اس کا حق اُس مرکز ملت کو ہوگا جو قرآن کے مطابق نظام قائم کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

سوال ۵ ۔ آپ نے لکھا ہے کہ مذہب نے ملوکیت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا (یا ملوکیت نے مذہب کے ساتھ مفاہمت کرلی)۔ کیا اس سے آپ کی یہ مراد ہے کہ بزرگانِ مذہب نے عمداً اور دانستہ ملوکیت کو تقویت دینے کیلئے اس قسم کا سمجھوتہ کر لیا؟ پھر آپ نے لکھا ہے کہ اس سمجھوتے میں روایات، فقہ اور تصوف نے ملوکیت کو بڑی مدد دی۔ کیا یہ چیزیں اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں؟

جواب ۵ ۔ میں نے نہ تو ملوکیت کی طرف کسی بادشاہ کا نام لیا، نہ مذہب کی سمت کسی بزرگ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا مقصود افراد نہیں بلکہ وہ نتیجہ ہے جس تک ہمیں تاریخ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے اسلاف کے متعلق میرا وہی مسلک ہے جو قرآن نے ہر مسلمان کے لئے متعین فرمایا ہے کہ اخوان الذین سبقونا بالایمان (کہ وہ ہمارے بھائی ہیں جو ایمان کے ساتھ

ہم سے پہلے رخصت ہو گئے)۔ باقی رہا یہ سوال کہ کس نے دانستہ کیا کچھ کیا اور نادانستہ کیا کچھ، سو اس کا فیصلہ خدا کر سکتا ہے۔ ہم اس امر کے لئے جج بننے پر مکلف نہیں۔ اس باب میں بھی میرا مسلک وہی ہے جسے قرآن نے حضرت موسیٰؑ اور فرعون سے مکالمہ کے ضمن میں فرمایا ہے کہ جب فرعون نے کہا کہ فما بال القرون الاولیٰ (اے موسیٰ یہ کہو کہ اسلاف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟) تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ علمھا عند ربی فی کتاب (کہ ان کا علم اللہ کے ہاں ان کے نامہ اعمال میں ہے)۔ بزرگانِ کرام میں سے جس کسی نے دین کی کوئی خدمت کی ہے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔ لیکن تاریخ کی یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ جس نظامِ دینی کو محمد رسول اللہ والذین معہ نے قائم کیا تھا، بعد میں وہ ثنویت میں تبدیل ہو گیا اور مذہب اور حکومت انسانی زندگی کے دو مستقل و دائرہ عمل قرار پا گئے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ کس طرح سے ہوا اور کن کے ہاتھوں سے، نہ ہی یہ کہ ایسا دانستہ ہوا یا نادانستہ۔ دانستہ ہو یا نادانستہ، نتیجہ ایک سا ہی مرتب ہوتا ہے۔ کوئی ماں اگر اپنے بچے کو نادانستہ دوائی کی جگہ زہر کی پڑیا دیدے تو اس کا نتیجہ بھی اسی طرح سے موت ہوتا ہے جس طرح دانستہ زہر دینے کا نتیجہ۔ ہم آج اس زہر کو اس لئے تریاق نہیں کہہ سکتے کہ اسے نادانستہ دیا گیا تھا۔ جتنی جلدی اس زہر کو زہر کہہ دیا جاتا بہتر تھا تاکہ آنے والے بچے اس سے ہلاک نہ ہو جاتے، اور اگر اس وقت تک نہیں کہا گیا تو کبھی تو اس کی ابتدا ہو گی۔ جب ہمارے پاس خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک یقینی معیار موجود ہے جو زہر کو زہر اور تریاق کو تریاق بتا دیتا ہے تو ہم اس پڑیا کو کیوں نہ پرکھ کر دیکھ لیں۔

باقی رہا یہ کہ کیا روایات، فقہ وغیرہ اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں؟ سو میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ان کا مقصد کچھ اور تھا لیکن انہیں اس نئے مقصد کے لئے استعمال کیا گیا، اور اس استعمال کے لئے پہلے یہ کیا گیا کہ انہیں ان کے اصل مقام سے ہٹا کر ایک نئی حیثیت عطا کر دی گئی۔ ان کی یہ نئی حیثیت اس خرابی کا اصل موجب ہے، اور جب تک انہیں ان کی اصلی حیثیت نہیں دی جائیگی یہ خرابی بدستور قائم رہے گی۔ دین کے غیر متبدل اصول قرآن کے اندر ہیں، ان کی جزئیات اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق امتِ محمدیہ نے خود متعین کرنی تھیں۔ دین کی اصلی سند قرآن تھا، اس لئے اسے یقینی طور پر محفوظ رکھا گیا۔ باقی چیزیں وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے تھیں، اس لئے انہیں محفوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہ کرام میں جب تک ان چیزوں کو یہی حیثیت دی جاتی رہی ان سے نفع ہی نفع برآمد ہوا، خرابی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ بعد میں آنے والوں نے ان روایات کو اس لئے اکٹھا کیا کہ ان سے اس عہدِ ہمایوں کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ یہ تھا جمع و تدوینِ روایات کا جذبہ محرکہ اور یہ تھا ان روایات سے مقصود، لیکن بعد میں جب ملوکیت کو اپنے مقام کے لئے مقدس سہاروں کی ضرورت پڑی تو انہیں اس کی جستجو ہوئی کہ یہ سہارے کہاں سے مل سکیں گے۔ قرآن سے یہ سہارے مل نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ قرآن کا ہر حرف اپنی اصلی شکل میں محفوظ تھا جس میں نہ کسی تبدیلی کی گنجائش تھی نہ اضافے کا

امکان۔ اگر کوئی شخص قال اللہ تعالیٰ کہہ کر ایک لفظ بھی ایسا اپنی زبان پر لاتا جو قرآن میں نہیں تھا تو ہزاروں ہاتھ اس زبان کو پکڑنے کے لئے بیک وقت اُٹھ آتے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ یہ قرآن میں نہیں ہے' اس پر اضافہ کیا جارہا ہے۔ لہٰذا ان سہاروں کیلئے کسی دوسری طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ گوشہ وہی ہو سکتا تھا جو قرآن کی طرح محفوظ نہیں تھا اور جس میں ہر قسم کے ردوبدل کی اور تحریف والحاق کی گنجائش تھی۔ یہ روایات کا مجموعہ تھا۔ جھوٹی روایات وضع کرنے میں کوئی مشکل ہی نہ تھی۔ لیکن اگر روایات کو محض تاریخ ہی قرار دیا جاتا تو ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان روایات کو دین قرار دے دیا گیا، بالکل قرآن جیسا دین (مثلہ معہ) بلکہ اس سے بڑھ کر کیونکہ روایات قرآن کی ناسخ بھی قرار دی گئیں اور اس پر قاضی بھی۔ جب روایات کی حیثیت تاریخ دین سے خود دین میں تبدیل کردی گئی تو پھر جس چیز کو جی چاہا دین بنا دیا۔ اس قسم کی ہزارہا کامیاب کوششوں کا ذکر خود ہماری کتب جرح و تعدیل میں موجود ہے جو غلط روایات سازی کے سلسلہ میں وجود پذیر ہوئیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی کوششیں ایسی بھی ہوں گی جنھیں احتساب کی نگاہیں نہیں پکڑ سکیں۔ ان دانستہ کوششوں کے علاوہ جو کچھ نادانستہ اور بڑی نیک نیتی سے ہوا وہ بھی اپنی مقدار اور مضرت رساں نتائج کے اعتبار سے کچھ کم نہ تھا۔ جب بھی ظنیات کو یقین کا درجہ دیدیا جائے' یہ کچھ ہونا لازمی ہے۔

جو کچھ روایات کے بارے میں ہوا وہی کچھ فقہ کے ساتھ ہوا۔ فقہ ان جزئیات کا نام تھا جو ارباب تفقہ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے وقت میں نافذ العمل ہونے کے لئے مدون کی تھیں۔ جب وہ زمانہ گزر گیا تو ان جزئیات کی حیثیت بھی تاریخ کی حیثیت رہ گئی' یہ بتانے کے لئے کہ فلاں زمانے میں قرآن کے فلاں اصول کو یوں عملاً نافذ کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ان فقہی جزئیات کو بھی غیر متبدل قرار دے کر دین بنا دیا گیا — قرآن جیسا دین — اور جس طرح روایات میں جو جی میں آیا اسے رسول اللہ صلعم کی ذات گرامی کی طرف منسوب کردیا گیا اسی طرح فقہ کے متعلق بھی جو مناسب سمجھا گیا کسی امام فقہ کے نام سے مشہور کردیا گیا۔ اس طرح یہ چیز بھی ملوکیت کی تقویت کا ذریعہ بن گئی۔

باقی رہا تصوف تو اس کا تو تصور ہی اسلام میں ایک اختراع تھی۔ اگر تصوف نام ہے اعمال میں اخلاص کا تو اس کے لئے نہ کسی جداگانہ اصطلاح کی ضرورت تھی نہ کسی فن کی۔ اس لئے کہ اخلاص سے خالی عمل کا نام قرآن کے ہاں منافقت رکھا جاتا ہے' اور عمل با اخلاص ہی ان نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جو قرآن نے اعمال صالحہ کے پرکھنے کے لئے واضح الفاظ میں بیان کردیئے ہیں تاکہ اس باب میں کسی کو کوئی غلط فہمی' کوئی دھوکہ یا اشتباہ کی گنجائش نہ ہو۔ لیکن تصوف نے اس ثنویت کو سند الوہیت عطا کردی جو مذہب اور دنیا میں تفریق کا باعث بنی تھی اور جس سے ملوکیت نے اپنی زندگی پائی تھی۔ قرآن نے عیسائیت کے متعلق کہا تھا کہ اس میں رہبانیت کو بطور ایک بدعت کے اختیار کیا گیا لیکن وہ اس بدعت کو بھی نباہ نہ سکے۔

اس لئے کہ انسان کے فطری جذبات دبانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ قرآن ان جذبات کو دوسری سمتوں کی طرف منتقل کر کے انھیں مفید نتائج کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ رہبانیت انھیں دبانے کی کوشش کر کے انھیں مختلف زمین دوز راہوں سے نکلنے پر مجبور کرتی ہے۔ مذہب اسی قسم کے غیر فطری دباؤ اور غیر فطری ابھار کی زندگی سکھاتا ہے اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے جذبات کا وہ Perversion جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری کتب روایات وفقہ میں اس قسم کے Perversion سے متعلق جتنا لٹریچر ملتا ہے وہ ان حضرات کا پیدا کردہ یا جمع کردہ ہے جنھوں نے روایات یا فقہ کی پہلے پہل جمع وتدوین کی۔ نہ معلوم اس لٹریچر میں کہاں کہاں کی چیزیں آکر شامل ہو گئیں اور کن راہوں سے یہ سانپ حریم کعبہ میں آگھسے۔ لیکن جب ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ کعبہ میں سانپ چھپا بیٹھا ہے تو کیا ہم اسے محض اس لئے باہر نہ پھینکیں کہ یہ سانپ غلافِ کعبہ سا لپٹا ہوا ہے؟ وقت ہے کہ ہم حریم کعبہ کو اس قسم کے بتوں سے پاک وصاف کریں۔ ان بتوں کی کعبہ میں باریابی نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصودِ رسالت، نہ بزرگانِ دین کے پیشِ نظر تھی، نہ مجتہدینِ ملت کا مدعا۔ ہماری بدبختی سے انھوں نے کسی نہ کسی طرح سے وہاں تک راہ پالی۔

تاریخِ رسالت - از پرویز

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیائے سابقہ کی
انقلاب انگیز دعوتِ توحید ——— اور

اقوام وملل گذشتہ کی عبرت آموز وبصیرت افروز داستانِ عروج وزوال

ضخامت سوا سات سو صفحات۔ مجلد قیمت پندرہ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

کیا حدیث قرآن کی تفسیر کیلئے ضروری ہے؟

بیا ور ید گر ایں جا بود سخندانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

(حکیم ابوالنظر صاحب امروہوی)

کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ فاران کی مارچ اور اپریل سالِ رواں کی اشاعتوں میں خود مدیر رسالہ ماہر القادری صاحب کے قلم سے افتتاحیہ کی شکل میں طویل مقالے شائع ہوئے ہیں جن میں جی بھر کر جناب پرویز کو گالیاں دی گئیں ہیں، اس جرم کی پاداش میں کہ تالوا ربنا اللہ یعنی وہ ارباب من دون اللہ کی مخالفت کرکے مسلمانوں کو صرف ایک خدا کی طرف دعوت کیوں دیتے ہیں۔ ان مقالات کا انداز اس قدر سوقیانہ اور مبتذل ہے کہ وہ کسی سنجیدہ غور و فکر کے درخور اعتنا نہیں۔ اس لئے ان کے "جواب" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ان میں بعض مقامات ایسے ہیں جن میں قرآن اور حدیث کی صحیح صحیح حیثیتوں کے متعلق عجیب قسم کا الجھاؤ پیدا کیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم ان مقامات کے متعلق مدیر فاران اور ان کے ساتھ ان قارئین فاران کے زاویۂ نگاہ کو درست کرنے کی کوشش کی جائے جو اسی قسم کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ سطورِ ذیل سے یہی مقصود ہے۔

آج اس سے بڑھ کر اور بد قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم ان بنیادی مسائل کے بجائے جنہوں نے ہمارے نوجوانوں سے یقینِ محکم کو چھین لیا ہے چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل پر خانہ جنگی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ سے جس بدترین غلطی کا آغاز ہوا تھا وہ آج تک برابر آگے بڑھ رہی اور پچھلی تباہیوں کو دوہراتی چلی جا رہی ہے۔ اسپین نے بھی اپنے نازک ترین وقت میں گروہ بندانہ اختلافات سے کنارہ کشی اختیار نہ کرکے تباہی مول لی اور ہم بھی نازک ترین پوزیشن میں ہونے کے باوجود سب سے بڑے فتنہ کا دروازہ بند کرنے کے نام پر "شخصی احتساب" پر اپنی تمام توتیں صرف کر رہے ہیں۔ کاش ہمارے اہلِ فکر اور اہلِ قلم حضرات کو اس چیز کا اندازہ ہوتا کہ وقت کا سب سے بڑا فتنہ کون سا ہے۔ آج بین الاقوامی انسانیت مذہب کو یا تو عظیم ترین فتنہ قرار دے رہی ہے، یا پرائیوٹ تصور۔ کیونکہ کسی قوم و ملت کے نزدیک بھی مذہب معاشی مسائل کو حل کرنے کے قابل نہیں۔ قومی مفاد پرستیوں کو محفوظ رکھ سکنے کے لئے یقیناً مذہبی بلاک بنانے میں بھی دلچسپی

لی جاری ہے لیکن کوئی بھی اپنی الہامی کتاب کی فکرِ مرتب سے مطمئن نہیں۔

ایسے حالات میں اپنے اپنے مذہبی تصورات کے تحت ان حضرات سے برسرِ پیکار رہنا جو اپنے نزدیک تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اسلام کی عظمت کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں، کیا بہتر نتائج پیدا کر سکے گا؟ اگر واقعی اسلام سے محبت ہے تو تعمیری ذہن کے سایہ میں ایسے فکری کارنامے پیش کرنے چاہئیں، جن سے نوجوانوں میں یقینِ محکم کا تازہ خون دوڑنے لگے، تاکہ حکومتی اقتدار کی مشینری کا پرزہ بن جانے کے بعد نوجوان پارٹی قراردادِ مقاصد کو ٹھوس حقیقت میں تبدیل کر سکے۔ کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ میرے محترم دوست ماہر القادری صاحب اس پہلو پر غور فرمائیں گے؟

شخصی احتساب کا پس منظر

میں نو واردانِ بساطِ ہوائے دل سے ہوں۔ اس لئے مجھے رازِ درونِ پردہ سے واقفیت نہیں ہو سکتی۔ لیکن لوگ کہہ رہے ہیں کہ شخصی احتساب کی وجہ پُر خلوص مذہبی جذبہ نہیں۔ بلکہ ہنگامی مقاصد کے لئے اسلامی جماعت کی تائید ہے۔ ورنہ پچیس سال سے پرویز کو فرہاد کی غیرت نے چیلنج کیوں نہیں دیا تھا؟ کیا فاران کو شائع ہوتے ہوئے بھی پورا نظامِ شمسی نہیں گذر گیا؟ جس زخم کی ٹیسیں پہلے ہی لمحہ میں محسوس ہونا چاہیے تھی وہ پورے سال تک کیوں محسوس نہ ہو سکی؟ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ پچھلے چند پرچوں میں طلوعِ اسلام نے اسلامی جماعت کے اغراض و مقاصد پر حملہ کیا تھا اس لئے اسلامی جماعت نے خود سامنے آنے کی بجائے فاران کو سپر بنایا ہو؟ اگر یہ ہم "سوءِ ظن" ساقی کوثر کے باب میں غلط ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا تحت الشعوری تصور تھا جس نے بے ساختہ "اربابِ اقتدار" کے مقابلہ پر اعلانِ حق کا جذبہ پیدا کر دیا؟ فاران و طلوعِ اسلام کی آویزش میں اربابِ اقتدار کا ذکر کیوں؟ اربابِ اقتدار کی جنگ ضرور ہو رہی ہے، مگر اسلامی جماعت سے۔ اگر آپ کا اس جماعت سے کوئی باضابطہ تعلق نہیں اور آپ اسلامی جماعت کے لئے سپر نہیں بننا چاہتے تو وہ کونسا محاذ ہے جس پر حکومتی مشینری سے ٹکراؤ کا اندیشہ ہے؟ آپ نے پچھلے پرچوں میں، لیکچروں میں، سیاسی جدوجہد میں وہ کونسا اندازِ فکر یا اندازِ کار اختیار کیا تھا جس سے ٹکراؤ کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہو؟

شخصی احتساب کی بنیادیں

میرے محترم دوست نے دو چیزوں کی وجہ سے شخصی احتساب کی ضرورت محسوس کی ہے۔

(۱) طلوعِ اسلام کے نزدیک قرآن فہمی کے لئے حدیث کی ضرورت نہیں اور صاحبِ فاران کے نزدیک قرآن کو بغیر

حدیث کے سمجھا ہی نہیں جا سکتا، کیونکہ خدا کی وحی کو براہِ راست انسانی دل و دماغ نہیں سمجھ سکتا۔

(۲) مراسم عبادت (نماز و روزہ وغیرہ) کے تصور اور کائناتی حسن کے مذہبی زاویۂ نگاہ سے حرام و حلال ہونے کے بارے میں فاران کو طلوعِ اسلام سے اختلاف ہے۔

ان ہی دو بنیادی اختلافات کی وجہ سے صاحبِ فاران کو ایک "نئے مذہبی فتنہ" کا طعنہ دینا پڑا۔ میں ان دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہم کسی نہ کسی حد تک ایک فیصلہ تک پہنچ سکیں۔ مگر اصل موضوع پر بحث چھیڑنے سے پہلے بعض ایسے گوشے بھی روشنی میں لانا پڑیں گے جن کے ذریعہ عوام کے مذہبی جذبات ابھارنے اور ان کے دل و دماغ کو سوچنے کے ناقابل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ ٹھوس علمی گفتگو کے درمیان ایسی چیزوں کو نہیں آنا چاہئے تھا۔

مجھے بھی مختلف مسائل میں طلوعِ اسلام سے اتفاق نہیں۔ "برزخ" کے سلسلہ میں مارچ کا پرچہ گواہ ہے۔ اور آئندہ بھی مجھ سے سنجیدہ علمی اختلافات کو نمایاں کرنے کا حق غصب نہیں کیا جا سکتا۔ اختلافات اگر تخریبی ذہن کی پیداوار نہ ہوں تو تنقیدی ذہن کو اجاگر کرنے اور نئے پہلوؤں کو سامنے لا سکنے کے لئے ہمیشہ ایک بہترین آلۂ فکر کی طرح استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جانے لگے تو وہ تنقید کی سطح سے نیچے آکر تنقیص کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

منصبِ نبوت | فاران کے اوراق پر بتایا گیا ہے کہ پرویز صاحب منصبِ نبوت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ نہ صرف اتنا ہی ہے، بلکہ پیغمبرِ اسلام کے قرآنی مناقب سن کر ان کے دل میں کبیدگی تک پیدا ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:-

> قرآن کی جن آیات میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور حیثیت کو متعین فرماتا اور بتاتا ہے کہ ہم نے نبی کو اس کام کے لئے بھیجا ہے وہ آیتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اور جو سمجھ میں آتی ہیں تو رسول اللہ کے مناقب سن کر ان کے دلوں میں یہ کچھاوٹ کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ بس سارا شرح صدر اس وقت تک ہی ہوتا ہے جب رسول اللہ کی احادیث کو مسلمانوں کی نگاہ میں بے وقعت اور ناقابلِ اعتبار ثابت کرنا چاہتے ہیں اور قرآن پاک میں رسول اللہ کے مناقب اور منصب کا ذکر آتے ہی دلوں میں تالے پڑ جاتے ہیں۔ (فاران۔ مارچ [illegible])

ان اشارات کے ذریعے جس ذہن کی تعبیر کی گئی ہے وہ کافرانہ ذہن کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ گویا پچیس سال کے بعد جناب پرویز کو جو پہلی نصیحت کی جا رہی ہے اس کا آغاز کفر کے فتوے سے ہو رہا ہے۔ وہ بھی "خبثِ باطن" کی دشنام بازی کے ساتھ۔ میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کئے لیتا ہوں کہ خدانخواستہ پرویز صاحب ایسے ہی ہیں۔ لیکن اس حدیث پرست

مسلمان کے لئے جو اسوۂ پیغمبر محفوظ رکھنے کے لئے حدیث کے وقار کو بچانا چاہتا ہو، یہ چیز کہاں تک مناسب ہوگی کہ وہ خود اسوۂ پیغمبرؐ سے توبہ کر لے۔ کیا پیغمبرؐ کا اندازِ سرزنش کافروں سے بھی ایسا رہا تھا؟ اور کیا اس اندازِ تبلیغ سے آپ دورِ فتنہ کو بند کر سکیں گے یا فتنہ کو نئی طاقت، نیا جوش دیا جا رہا اور نئے حربے ایجاد کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے؟ دشمن کا جامہ پہن کر پیغمبر بھی اپنی تبلیغ میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے، تا بہ دیگراں چہ رسد۔

پھر لطف یہ ہے کہ منصبِ نبوت سے کبیدگی اس شخصیت کی طرف منسوب کی جا رہی ہے جو ابھی سینکڑوں صفحات میں "معراجِ انسانیت" کے نام سے قرآن کی روشنی میں پیغمبرِ اسلام کی سیرت پر ایک نئی تصنیف مرتب کر کے اٹھا ہے اور جس احترام و عقیدت سے اس تصنیف کو مرتب کیا ہے اس کا لفظ لفظ اس کا آئینہ دار ہے۔ منصبِ نبوت کے اجارہ دار جو کام نہ کر سکے کیا وہی خدمت اگر کوئی دوسری شخصیت انجام دیدے تو آپ کے مذہب میں وہ کافر ہو جاتا ہے؟ اگر ساری علمی زندگی کی جدوجہد کا نتیجہ پیغمبرِ اسلام کی عظمت قائم کرنے کے لئے ایک ضخیم جلد کی شکل میں سامنے آ چکا ہو اور اس سے قبل تین ضخیم جلدیں حضورؐ کے پیغامِ رسالت کی تشریح و تفسیر پر اس انداز سے منصۂ شہود پر آ چکی ہوں کہ ان سے ہزار ہا راہ گم کردہ نوجوان پھر سے اسلام کی عظمت کے معترف ہو رہے ہوں، تو کیا وہ زندگی کافرانہ زندگی ہو سکتی ہے؟ گروہ بندی سے بالا تر ہو کر سوچئے کہ آپ کیا الزام لگا رہے ہیں اور کس پر لگا رہے ہیں؟ اگر آپ نے ہنوز وہ جلد مطالعہ نہیں فرمائی تو کم از کم طلوعِ اسلام کے پچھلے پرچوں میں ہی پڑھا ہوگا،

> نبی اکرمؐ کی پوری حیاتِ طیبہ، قرآن کے مطابق تھی۔ خود قرآن میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ آپ وحی کی اتباع کریں۔ حضورؐ کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ میں قرآن کی اتباع کرتا ہوں۔ اگر قرآن میں یہ کچھ بصراحت مذکور بھی نہ ہوتا تو بھی اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ، قرآن کی اتباع تھی۔ اس لئے کہ اگر رسول بھی اپنی وحی کی اتباع نہ کرے گا تو اور کون اتباع کرے گا۔ رسولؐ کے ساتھ ہی وہ جماعت سامنے آتی ہے جو رسول کی تربیت یافتہ تھی اور قرآنی نظام کے قیام کی اولین ذمہ دار تھی۔ ظاہر ہے کہ قدوسیوں کی اس جماعت کی زندگی بھی قرآن ہی کی اتباع تھی۔ (طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۴۹ء)

ایک مسلمان سے آپ پیغمبرانہ عظمت کے اعتراف میں اور کیا چاہتے ہیں۔ کیا یہ ہی وہ "بغاوت" ہے جو آپ نے ان کے دل میں محسوس کی تھی؟ دشمنی ہو یا دوستی۔ انصاف اور دماغی توازن سے محرومی نہیں گوارہ کر لینا چاہیئے؟

آپ اگر اس بات پر خفا ہیں کہ حدیث کو ظنی کیوں کہہ دیا گیا تو اس ظن کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے، جس کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ پوری اسلامی تاریخ میں کوئی معتبر محدث یا متکلم ایسا گزرا ہے جس نے حدیث کو قرآن

کی طرح یقینی کہا ہو۔ حدیث بلاشک ایک ظنی حقیقت ہے اور قیامت تک ظنی ہی رہے گی۔ مگر ظنی کہہ دینے کا مطلب ہرگز حدیث کو ٹھکرا دینا نہیں۔ خود طلوع اسلام کے الفاظ پر غور فرما کر فیصلہ کیجئے۔

> اب اگر ہم دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے اور تاریخ (کتب روایات وسیر) میں نبی اکرمؐ یا صحابہؓ کا کوئی عمل یا قول اس کے خلاف مذکور ہے تو ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنا ہوگا کہ تاریخ نے اس واقعہ کو ہم تک صحیح طور پر نہیں پہنچایا۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہ عمل یا قول قرآنی حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ ہے ہی نہیں جو قرآن کے ماننے والوں کے نزدیک قابل قبول ہو۔ اس لئے کہ قرآن حتمی ہے اور تاریخ ظنی اور جب بھی ظن اور یقین میں تصادم و تنازع ہوگا تو یقین کو بہر حال و بہر نوع صحیح تسلیم کیا جائے گا۔ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔
>
> لیکن ہماری بدبختی کہ ہم نے ظن کو یقین پر غالب قرار دے رکھا ہے۔ چنانچہ یہ چیزیں ہمارے عقیدہ میں داخل ہیں کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے، حتی کہ اس کی ناسخ بھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دین یکسر ظنیات کا مجموعہ بن چکا ہے۔ (طلوع اسلام نومبر ۱۹۴۹ء)

حدیث کو قرآن کے مقابلہ میں ظنی کہہ دینے والا اگر منصب نبوت کے منکروں میں شامل کیا جا سکتا ہے تو کیا حدیث کو قرآن سے زیادہ یقینی ذریعۂ علم قرار دینے والا صدیقین و شہداء کے زمرہ میں شامل کر دینے کے قابل ہو جائے گا؟ حدیث کے بارے میں مذہبی غلو اور شدت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج دیکھتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کا ایک گروہ قرآن کی علمی رہنمائی اور اسلام کے مستقبل سے مایوس ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہماری پچھلی تاریخ میں حدیث پر جتنی قوت خرچ کی گئی تاریخ ہی گواہ ہے کہ قرآن پر اس کا ہزارواں حصہ بھی صرف نہ کیا جا سکا۔ حتی کہ دارالعلوم دیوبند جیسا مدرسہ آخری چند برسوں سے پہلے تک برائے نام بھی دارالقرآن اور شیخ التفسیر نہ پیدا کر سکا؟ محدثین دیوبند کی صدہا تقریروں کا آج بھی ریکارڈ موجود ہے لیکن قرآن کی گہرائیاں دریافت کرنے والے ذوق نے پورے عرصہ میں ایک مرتبہ بھی کروٹ نہیں لی۔ آخری دور میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے شاہ عبد القادر صاحبؒ کے ترجمہ میں معمولی تبدیلیاں کرتے ہوئے فٹ نوٹس (Foot Notes) میں پچھلے مفسرین کے خیالات کا کچھ خلاصہ سا پیش فرمایا تھا جس کی تکمیل حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے ہاتھوں ہو سکی۔ خود مولانائے عثمانیؒ نے بھی پچھلی متضاد تفسیروں کو جمع کرنے ہی کا کام کیا تھا نہ نئی تحقیقات، یا نئے زاویہ ہائے نگاہ پیش کئے گئے، نہ پچھلے محققین کے درمیان محاکمہ ہی کیا گیا۔ گویا کہ ہم صدیوں پہلے جو معلومات جمع کر چکے تھے، انھیں کو دہرانے کا فرض انجام دیا جاتا رہا ہے، حالانکہ احادیث کے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہئے تھا کہ قرآن کے

عجائب و غرائب کسی دور میں بھی ختم نہیں ہو سکتے۔

جناب پرویز نے یہ کہا تھا کہ خود رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا جس سے ظاہر ہے کہ یہ منشائے نبوت ہی نہ تھا کہ احادیث قیامت تک کے لئے غیر متبدل ضابطۂ زندگی کی حیثیت اختیار کریں۔ اس پر مدیر فاران اُن پر کفر کا فتویٰ لگا رہے ہیں۔ لیکن مدیر فاران یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ اس باب میں ہمارے دور کے سب سے بڑے شیخ الحدیث کا مسلک بھی یہی تھا۔ انھوں نے غالباً حضرت استاذی علامہ انور شاہ صاحب شیخ الحدیث (دیوبند) کا نام سنا ہوگا۔ دیکھئے کہ جمع حدیث اور مقام حدیث کے سلسلے میں ان کا کیا فیصلہ ہے وہ فرماتے ہیں:۔

> ان جمع الحدیث فی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان کان احسن فی بادی الرأی الا ان المرضی ان لا تدون الاحادیث مثل تدوین القرآن ولا یحفظ حفظہ ـــــ لا تنتہی فی الختم نہایتہ ولا تبلغ فی الاہتمام بالفاظہا مبلغہا بل تبقی فی مرتبۃ ثانیۃ یمشی فیہا الاجتہاد و تفحص العلماء و غور الفقہاء و بحث المحدثین یتفسح علیہم امر الدین و یتوسع علیہم من کل جانب۔ (فیض الباری مطبوعہ مصر ۳۵ ج ۱)
>
> اگرچہ سرسری نظر سے عہد زمانۂ پیغمبر میں احادیث کا جمع ہو جانا زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن پیغمبر اسلام کی یہ منشا ہی نہ تھی کہ قرآن کی طرح حدیث کو جمع اور حفظ کیا جائے ـــــ پیغمبر اسلام یہ چاہتے تھے کہ حتمی اور یقینی ہونے میں حدیث قرآن کے برابر ہو جائے نہ قرآن کی طرح پیغمبرانہ الفاظ کے ساتھ اہتمام کرنا پسند تھا بلکہ مقصد ہی یہ تھا کہ قرآن کی طرح نہ حدیث کو مرتب کیا جائے نہ حفظ کیا جائے بلکہ اسے دوسرے درجہ ہی میں رہنے دیا جائے تاکہ اختراعی ذہن کی جولانی، محققین کی تلاش و جستجو، قانون سازوں کے گہرے مطالعہ اور محدثین کی بحث و گفتگو کے لئے دروازے کھلے رہیں۔ تاکہ مسلمانوں پر دین کا معاملہ زیادہ کشادہ ہو جائے اور ہر طرح کی سہولتیں مسلمانوں کو قانون سازی کے بارے میں میسر آسکیں۔

علماء متقدمین کی تاریخ میں ایسے حوصلہ مند علماء پائے جاتے ہیں جو ساری عمر حدیث کی خدمت میں بسر کر دینے کے باوجود متوازن دل و دماغ کی روشنی سے رہنمائی دے سکے۔ ہمارے دور میں حضرت علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ کوئی فنِ حدیث کا رمز شناس، حافظِ حدیث نہیں گذرا۔ اگر ان کا فیصلہ بھی "پرویزی فتنہ" سے نہ بچ سکا اور حدیث کو ظنی بلکہ قابلِ بحث و گفتگو قرار دینے پر مجبور ہو گیا تو آپ کو سوچنا ہی پڑیگا کہ حق پرستی اسلامی جماعت ہی کے لئے رجسٹرڈ نہیں ہو گئی۔ دوسرے بھی حق پرست ہو سکتے اور اس کا اعلان کر سکتے ہیں۔

جناب پرویز کا دوسرا جرم یہ ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ جن احکام کی جزئیات خود قرآن نے متعین نہیں کیں بلکہ انھیں محض اصولی طور پر بیان کیا ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ یہ جزئیات ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآنی نظام کو نافذ کرنے والی ملت خود وضع کرتی رہے گی۔ لہٰذا غیر متبدل وہ ابدی اصول ہیں نہ کہ ان کے تشریعی احکام، میں اس باب میں بھی جناب مدیر فاران کے اضافہ معلومات کی خاطر ایک ایسی سند پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جسے غالباً وہ آسانی سے رد فرمانے کی جرأت نہ فرما سکیں گے۔ دیکھئے کہ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا کیا ارشاد ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

فطرۃ فطر اللہ الناس علیھا ولن تجد لفطرۃ اللہ تبدیلا۔ ولیس ذالک الا فی اصول البر والاثم وکلیاتھا دون غیرھا وحدودھا وھذہ الفطرۃ ھو الدین الذی لا یختلف باختلاف الاعصار۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

وہ فطرت جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور جس میں تم ہرگز تغیر و تبدل نہ پاؤ گے وہ محض نیکی اور گناہ کے اصول اور ان کے کلیہ قاعدے ہیں، نہ کہ ان کے فروع و حدود۔ اور یہی فطرت ایسا دین ہے جو کسی زمانہ میں تبدیل نہیں ہوتا، باوجودیکہ زمانے بدلتے رہتے ہیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ غیر متبدل دین کس چیز کو قرار دے رہے ہیں؟ اسی چیز کو جسے آپ فتنہ پرویزی کہکر جہنم میں جھونک دینے کی تلقین فرما رہے ہیں؟

قرآن فہمی اور اس کے ذرائع

وقت کے نشیب و فراز اور معاشرتی انقلابات کے تقاضے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ حضرت عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے "حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے خدا کی کتاب کفایت کرتی ہے) پیغمبر اسلام کو ہدایت نامہ چھوڑنے سے روک دیا تھا اور ایک آج کا وقت ہے کہ "حسبنا کتاب اللہ" کا عقیدہ رکھنے والا کافروں کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ یہ نازک وقت حدیث پیغمبر پر بھی گزر چکا ہے۔ فقہا پرستی نے صدیوں تک اہل حدیث کو غیر مقلد اور واجب ترک کرنے والوں میں شمار کیا تھا۔ اُدھر فقہ بھی اس زہر آلود نشتر سے اپنی رگ جان کو نہ بچا سکی۔ کائناتی زندگی میں سب سے پہلے قیاس سے کام لینے والا شیطان کو قرار دے کر فقہا کو اہل قیاس کا طعنہ دیا جاتا رہا اور منکر حدیث۔ لہٰذا اگر آج حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں کو گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے تو یہ اسی ساز کہن کی شکست کی آواز ہے۔ لیکن ان بدلتے ہوئے تقاضوں کے زلزلے ہی وہ مقام ہوتے ہیں جہاں "راسخون فی العلم" کی آزمائش ہوتی ہے۔ جو لوگ وحی کی گہرائیوں، پہنائیوں اور بلندیوں کا ٹھیک اندازہ رکھتے اور اس یقینی علم کی بنیادوں پر مضبوطی سے کھڑے ہو سکتے ہیں، انھیں پارٹیوں کی دھوپ چھاؤں ڈانواں ڈول نہیں کر سکتی۔ وہ ایک بلند و بالا جہاز کی طرح طوفانی تھپیڑوں میں

سینہ تانے ہوئے اپنی راہ پر چلے جاتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ ٹھوس سچائیوں کا مطالعہ کرتے رہیں، چاہے گروہ بندانہ جذبات کی آندھی ان آنکھوں میں خاک بھر رہی ہو جو شمعِ ہدایت کی روشنی سے اپنی راہ متعین کرنا چاہتے تھے۔

اہلِ قرآن ہونا کوئی ایسا اخلاقی جرم نہیں ہے کہ ایک شریف انسان کی نگاہیں اس کا ارتکاب کرنے پر شرم سے جھک جائیں۔ نہ اہلِ حدیث ہونا اتنا قابلِ فخر ہے کہ کائنات کی ہر ملکوتی طاقت آپ کی قدم بوسی کے لئے بے چین ہو جائے۔ ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھئے (اس ہی کا نام "حدود اللہ" کی پابندی ہے) اور دیکھئے کہ اگر کسی دلِ مسلم نے اس زمانہ میں جبکہ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ جیسا وسیع معلومات رکھنے والا شخص اپنی تصنیف نظامِ تعلیم و تربیت جلد دوم میں بانگِ دہل کہہ رہا تھا کہ جس قرآن نے نماز روزہ کو بنیادی چیز قرار دے کر بھی تفصیلات سے آشنا نہ کیا ہو وہ تجارت، سیاست وغیرہ کے قوانین کیا بتا سکے گا؟ اور اہلِ فقہ کہہ رہے تھے کہ لاکھوں مسائل کے بارے میں فقہا ہی کی بصیرت پر بھروسہ رکھنا پڑے گا، کیونکہ چند ہزار احادیث تشنگی نہیں دور کر سکتیں، یہ کہہ دیا ہو کہ قرآن اپنے دل کی بات، اپنی زبان میں ادا کر سکنے کے قابل ہے اور وہ کسی ضمیمہ کا محتاج نہیں تو کیا یہ گناہ، گیلانی صاحب والے گناہ سے زیادہ شرمناک ہے؟ اگر ضمیمہ ضروری ہوتا تو کیا پیغمبرِ اسلام یہی حکم دیتے کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئا غیرہ فلیمحہ[1]

میری طرف سے قرآن کے سوا کوئی چیز نقل نہ کی جائے اور جس نے میری کوئی چیز لکھ لی ہو اسے چاہئے کہ مٹا ڈالے۔

بالکل قوم ھاد (ہر قوم کو رہنمائی دینے والا) پیغمبرِ اسلام، اس قرآن کے ضمیمہ کو جو ان ھو ذکر للعالمین (یہ قرآن بین الاقوامی انسانیت کے لئے تاریخی یادداشت ہے) تھا، باضابطہ جمع کر کے سرگرشتہ اقتدار و غلبہ تک پہنچانے کی مسلسل کوشش نہ کرتا رہتا، تاکہ انسانیت قرآن فہمی سے محروم نہ رہ سکے۔ چند صحابہ کے استفسارات کا جواب دے دینا اور صحابہؓ کا اپنے اپنے ذوقِ طبع کے مطابق طرح طرح کی باتوں کو کسی حد تک یاد رکھنا، ہرگز اس ذمہ داری کو کم نہیں کر سکتا جو ایک بین الاقوامی پیغمبر پر عائد ہوتی ہے۔ کیا قیامت ہے کہ جن تفسیری نکات کے بغیر قرآن سمجھا ہی نہیں جا سکتا انھیں نہ خلافتِ راشدہ کے بہترین نظام نے جمع کرنے میں دلچسپی لی، نہ صحابہؓ کرام کی پوری جماعت نے اسے سپردِ قلم فرمایا، نہ محدثین کرام ہی سب کچھ جمع کر سکے

---

[1] اگر یہ تاویل تسلیم بھی کر لی جائے کہ قرآنی آیات کو محفوظ رکھنا مقصود تھا تب بھی کیا اس اندازِ سرزنش سے ضمیمۂ قرآن کے راستہ میں ناقابلِ عبور خلیج حائل ہونے کا خوف نہیں پیدا ہوتا تھا اور کیا پیغمبرِ اسلام نے اس پہلو کو کسی دوسری جگہ صاف کر دیا تھا؟ علامہ مناظر احسن گیلانی اس تاویل کو تسلیم نہیں کرتے اور انکار کے دلائل دیتے ہوئے یہ جدید نظریہ پیش فرماتے ہیں کہ پیغمبر کے اقوال و احوال میں سے ایک حصہ قابلِ اشاعت نہ تھا، اُسے لکھنے سے منع کر دیا گیا۔ کیا یہ تاویل پچھلی تاویل سے بھی بدتر نہیں؟ ظلمات فوقہا ظلمات۔ (ابو المنظر رضوی)

جو قرآن فہمی کے لئے ضروری تھا۔

پس چہ باید کرد اے اصحاب دیں!

عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے کسی مذہبی گروہ کے لئے جگہ پیدا کرنا جتنا آسان ہے، حدیث کو قرآن فہمی کے لئے ضروری ثابت کرنا اتنا آسان نہیں۔ اگر احادیث سے قرآن کی تفسیر مل گئی ہوتی تو مفسرین تضاد بیانی اور منتشر خیالی کا شکار کیوں ہوتے؟ شاید میرے محترم دوست ماہر القادری صاحب نے ابھی تک تفاسیر کی دردناک داستان نہیں سنی، ورنہ شایان کا تفسیری سے اعتماد اٹھ جاتا۔ اگر اسلامی جماعت کے کسی مذہبی عالم نے میرے اس دعوے کی تردید کرنے کے لئے جرات سے کام لیا تو بتاؤں گا کہ قدیم طرز فکر کو کتنی اندھیریوں اور ٹھوکروں سے گزرنا پڑا تھا، اور تفسیری جدوجہد میں کتنی ناکامیاں ہیں جو ابھی تک اختراعی دماغ رکھنے والے مجتہدین کا انتظار کر رہی ہیں۔

فاضل مدیر فاران نے اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ قرآنی نکات کو احادیث کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا، دو تین آیات کی وہ تفسیر بیان فرمائی ہے جو احادیث میں درج ہے۔ آیئے ذرا اس تفسیر کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں اور پھر سوچیں کہ کیا ان سے فی الواقعہ قرآن کا مطلب واضح ہو جاتا ہے؟

چند آیات کی تفسیر بالحدیث

(۱) انہوں نے پہلی آیت یہ پیش فرمائی ہے:

ولقد آتیناک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم۔

اس آیت کی تشریح میں ایک روایت بتاتی ہے کہ سبع مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ تھی۔ اس لئے اس کا ترجمہ ہوگا "درآنحالیکہ ہم نے تجھے سات آیات دی ہیں بار بار نماز میں دہرائی جانے والی اور قرآن"۔

یہ سورۂ حجر کی آیت ہے۔ سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا ہے کہ پہلے امم سابقہ کی تباہیوں کا ذکر ہے۔ پھر ارشاد ہے کہ وما خلقنا السموٰت والارض وما بینهما الا بالحق وان الساعة لآتية فاصفح الصفح الجميل (اور ہم نے آسمانوں کو اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بالحق پیدا کیا ہے۔ اور یقیناً ساعت موعود آ کر رہے گی۔ سو حسن کارانہ انداز سے درگزر کرتے رہو) ان ربك هو الخلّٰق العليم (یقیناً تیرا رب خلاق و علیم ہے)۔ اس کے بعد ہے "ولقد آتیناک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم"۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ عرب کے ان سرمایہ دار لوگوں سے خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اپنی پارٹی تیار کرتے رہئے۔

اس پس منظر اور پیش منظر میں اگر آپ سبع مثانی والی آیت کو رکھ کر دیکھیں تو قرآنی تصور کا حسب ذیل خلاصہ سامنے آئے گا۔

> پچھلی قومیں تباہ ہوتی رہیں۔ زمین و آسمان حق پر پیدا کئے گئے ہیں۔ قیامت آنے والی ہے۔ خوبصورتی سے درگذر کرتے رہو۔ ہم نے سورۂ فاتحہ ہر نماز میں دہراتے رہنے کے لئے بتا دی ہے اور قرآن نازل کر دیا۔ سرمایہ داروں سے خوف زدہ نہ ہو۔ اپنی پارٹی تیار کرتے رہو۔

ذرا غور کیجئے کہ "سبع من المثانی" کی جو تفسیر حدیث نے بیان فرمائی ہے اس کی رُو سے قرآن کریم کی ان آیات کا کوئی واضح مفہوم آپ کے ذہن میں آتا ہے؟ کیا اس سے کوئی تک بنتی بھی ہے؟ پھر یہ بھی سوچئے کہ کیا سورۂ فاتحہ قرآن سے الگ چیز ہے جو یہ فرمایا کہ ہم نے "سورۂ فاتحہ دیدی اور قرآن عظیم"؟ اور کیا مختلف سورتوں کو اپنی اپنی مخصوص اہمیت کے پیش نظر قرآن سے الگ کرتے رہنے کا نتیجہ خود قرآن کے حق میں بہتر نکل سکتا ہے؟

ہمارے ماہر صاحب نے مفسرین کو یہ حدیث نقل کرتے ہوئے دیکھ کر ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ ربط آیات کی روشنی میں قرآن کے اس تصور پر سوچتے۔ غور کیجئے کہ حدیث کی اس تفسیر سے بالآخر اس آیت کا مطلب کیا نکلا!

اب دوسری مثال لیجئے۔ اس کے لئے ماہر صاحب نے یہ آیت نقل فرمائی ہے۔

وانزلنا من السماء ماء طہورا

اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا

اس کی تفسیر میں ارشاد ہے کہ اس آیت نے صحابہ کرام کو اس الجھن میں مبتلا کر دیا کہ قرآن نے پاک کرنے والا پانی "بارش کا پانی" بتایا ہے۔ معلوم نہیں کہ سمندر کا پانی (جس کا زمین سے تعلق ہے) بھی پاک کرتا ہے یا نہیں۔ (غور فرمایئے! سمندر کی موجوں سے کھیلنے والے عربوں کو شبہ پیدا ہو تو صرف سمندر کے پانی کی نسبت۔ کنوؤں اور تالابوں کے پانی کے متعلق انہوں نے استفسار نہ کیا؟) اس کے بعد ارشاد ہے "اس مسئلہ کے جواب میں فرمایا گیا کہ سمندر کا پانی اور مردار دونوں پاک ہیں۔"

غور فرمایئے کہ کس قدر مشکل مسئلہ تھا جسے حدیث کی تفسیر نے حل کر دیا کہ سمندر کا پانی بھی پاک ہوتا ہے؟ اور پھر اس پر بھی غور فرمایئے کہ بات تو تھی سمندر کے پانی سے متعلق۔ جواب میں "مردار" کہاں سے آگیا؟ اور مردار کیسے پاک ہو گیا؟ اگر سمندر میں بیل، بکری، گھوڑا گر کر مر جائے تو کیا وہ مردار ہمارے لئے پاکیزہ اور خوشگوار چیز بن سکتا ہے؟ اگر حدیث کچھ اور تھی ترجمہ کچھ اور کیا گیا ہے تو ہم ماہر صاحب سے عرض کریں گے کہ وہ مردار کی پاکیزگی کا فلسفہ بتا دیں تاکہ "جواب و سوال" کے اس انداز کا راز معلوم کیا جا سکے جس پر علم فقہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

تیسری مثال میں یہ آیت بیان فرمائی گئی ہے:

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الامن وھم مھتدون -

جنہوں نے ایک خدا پر یقین کیا اور اپنے یقین میں حدود شکنی اور زیادتی کو خلط ملط نہیں کر دیا ان ہی کو امن و سکون کی زندگی نصیب ہو سکے گی اور وہ ہی ہدایت یافتہ ہیں۔

اس کی تفسیر میں فاران میں لکھا ہے:

اس آیت کو سن کر صحابہ کرام کو سخت تشویش لاحق ہوئی اور رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں کون ایسا شخص ہے جس نے ایمان لانے کے بعد کسی قسم کا ظلم اور معصیت ہی کا ارتکاب نہ کیا ہو . . . . . . اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اس آیت میں ظلم سے شرک مراد ہے . . . . . تعلق وحی اساس سے یہ جواب اور آیت قرآن کی شرح سن کر صحابہ کی تشویش دور ہوئی۔

ماہرالقادری صاحب نے صرف لفظ "ظلم" کے معنی متعین کرسکنے کیلئے اس روایت سے یہ ہنگامہ خیز قصہ صحیح فرما دیا، حالانکہ بات بالکل صاف تھی۔ جو روایت پرست پارٹی اس تفسیر کو تسلیم کرتی رہی ہے وہ خود بھی اس تفسیر سے مطمئن نہیں حتیٰ کہ ظلم کا ترجمہ شرک سے کرنا بھی پسند نہیں کیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اپنے ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرات مفسرین اور شراح حدیث کے اقوال اس جواب کی تقریر میں مختلف ہو گئے جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے۔ ـــــ دوسرا اختلاف خلجانِ صحابہ کے جواب میں مفسرین وغیرہ علماء کرام کو پیش آگیا کہ جواب کا مقصد اور اس کا ماخذ کیا ہے ـــــ اس لئے ترجمہ میں اس سے قطع نظر کرکے ظاہر کے موافق صحیح ترجمہ فرما دیا ـــــ شاہ عبدالقادر صاحب نے ظلم کے ترجمہ میں لفظ "تقصیر" بیان فرمایا، جس سے اور بھی وضاحت اور تکمیل ہو گئی۔ اب اس میں غور کرنے سے نہ آیت میں کوئی خلجان ہوتا ہے، نہ آپ کے ارشاد میں اختلاف باقی رہتا ہے۔

گویا کہ ہمارے محترم مخاطب نے جس حدیث کا سہارا لے کر فیصلہ کن معنی تک پہنچنے کی جدوجہد فرمائی تھی وہ خود علماء کے باہمی اختلاف کو بھی نہ مٹا سکی۔ جب تک انسانی شعور مطمئن نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی روایت کے نام پر آپ کسی کا دل و دماغ خرید سکیں۔ اگر حدیث واقعی ظلم کی تشریح میں کامیاب ہو گئی ہوتی تو تراجم قرآن میں ظلم کے نیچے شرک لکھا جاتا، لیکن چونکہ اس غلط ترجمہ سے کسی کا دل بھی مطمئن نہیں ہوا اس لئے کسی نے بھی اپنے قلم کو اس سے آلودہ نہ کیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ روایت بنانے والے نے قرآن کا ٹھیک ٹھیک مطالعہ ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے بہت جلدی میں رائے قائم کی ورنہ کچھ نہ کچھ کامیابی کے امکانات ہو سکتے تھے۔

زیر بحث آیت سے پہلے ایک اور آیت ہے:

وکیف اخاف ما اشرکتم ولا تخافون انکم اشرکتم باللہ مالم ینزل بہ علیکم سلطانا فای الفریقین احق بالامن ان کنتم تعلمون۔ (انعام)

تمہارے بنائے ہوئے شریکوں سے میں کیونکر خوف زدہ ہو سکتا ہوں۔ حالانکہ تم خدا کا شریک بنانے سے خوف نہیں کر رہے۔ جبکہ تمہارے بنائے ہوئے شریک کو خدا نے غلبہ کی طاقت ہی نہیں دی۔ ایسی حالت میں ہم دونوں پارٹیوں سے کون امن و سکون کی زندگی کا زیادہ حقدار ہونا چاہئے۔ اگر جانتے ہو تو بتاؤ۔

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم کے درمیان ہونے والی بحث و گفتگو کو نقل کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ ہم دونوں میں اُس پارٹی کو خوف زدہ ہونا چاہئے جو بے طاقت خدا سے سہارا تلاش کرے ورنہ جس کے خدا میں غلبہ حاصل کرسکنے کی طاقت ہو اُسے خوف زدہ اور پریشان ہونے کی کیا وجہ؟

روایت کرنے والے نے آیت کے اس ٹکڑے میں شرک اور امن کا یکجائی تصور دیکھ کر فرض کر لیا کہ قرآن اسی تصور کو دوہرانے کے لئے اگلی آیت میں بھی یہی بات کہہ رہا ہے۔ حالانکہ قرآن نے اگلی آیت کا اضافہ کرکے ایک علمی سوال کو حل کیا تھا۔ شبہ ہو سکتا تھا کہ کیا صرف توحید پر یقین کر لینے اور عقیدہ پر جم جانے سے امن و سکون کی زندگی نصیب ہو سکتی ہے؟ تاریخی واقعات جس نظریہ کی تائید نہیں کر رہے، قرآن اسے اپنے بزرگ ترین پیغمبر کے ذریعہ کیونکر پیش کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔ اس ہی لئے قرآن نے اگلی آیت کا اضافہ کرکے بتا دیا کہ خدا پر یقین کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی میں یقین اور حدود شکنی کو ہم آغوش نہ کر رہے ہوں۔ اگر حق و باطل اور یقین و ظلم کو باہم مخلوط کر دیا جائے گا تو زندگی کی کیمیاوی ترکیب اور اس کے خواص و اثرات تبدیل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ امن کی زندگی حاصل کرسکنے کے لئے ذہنی اور عملی پہلوؤں کو ساتھ ساتھ ہموار کرنا پڑیگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ذہنی طور پر کسی سچائی کا دعویٰ کرنے یا ایک گونہ ذوقی یقین کا احساس کرتے ہی سے امن و چین کی زندگی نصیب ہو جائے۔ ایک طاقت اور ایک قانون پر یقین رکھتے ہوئے اس قانون کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ بدامنی سے نجات نہ ہو سکے گی۔

علاوہ ازیں اگر قرآن کا مطالعہ پوری دلچسپی سے کیا جاتا تو ظلم کی تفسیر شرک سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ شرک ظلم عظیم اور زبردست حدود شکنی ضرور ہے، بلکہ حدود شکنی کی بنیاد بھی۔ لیکن جہاں قرآن نے تخصیص نہ کی ہو، وہاں بغیر کسی علمی اور شعوری تقاضے کے کمی بیشی کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جبکہ دین ظلم کے معانقہ کی نوعیت ایک دوسری جگہ متعین بھی کر دی گئی ہو۔ ارشاد ہے:

وکذلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادہم شرکاؤہم لیردوہم ولیلبسوا علیہم دینہم (انعام)

بہت سے مشرکین کے لئے اپنی اولاد کو مار ڈالنا خوشنما بنا دیا، شریک بنائے ہوئے دیوتاؤں نے، تاکہ ان کی اجتماعی زندگی کو تباہ کردیں اور خلط ملط کردیں مشرکین پر ان کا معاشرتی ضابطۂ حیات۔

ظلم و دین کا باہم مخلوط ہو جانا اخلاقی قدروں سے بے نیاز ہو جانے کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اخلاقی قدروں اور دین ہی کی بنیاد پر ایسی کارکردگی کو وابستہ کردیا جاتا ہے، جو اخلاق کی غلط تعبیر ہونے کی وجہ سے تباہ کن ہوتے ہوئے بھی مذہب پرستوں کو خوشنما ہی محسوس ہوتے ہیں۔ اس مخلوط زندگی کے زیر اثر اخلاقی قدروں سے کشش کا احساس تو نہیں مٹتا لیکن امن و بے خوفی کسی گوشۂ حیات میں بھی نہیں پائی جاتی۔ یہی تجرباتی شعور کا وہ نازک پہلو تھا جسے یقین کرنے والوں کے سامنے رکھنا ضروری خیال کیا گیا۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے تغافل نے قرآن کی نکتہ آفرینیوں سے ناآشنا کردیا اور اس طرح یہ ہماری پارٹی تہی دست اور خوفزدہ پارٹی بن کر رہ گئی۔ لہذا آیۃ زیر بحث کا صاف مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے ایک خدا کے ایک قانون کو دل سے تسلیم کرلیا اور اس کے بعد عملاً اس قانون کو توڑا نہیں (یہی ظلم کے معنی ہیں) وہی لوگ امن کی زندگی بسر کریں گے یعنی امن کی زندگی کے لئے ایمان اور اس کے مطابق عمل ناگزیر ہیں۔ زبان سے ایمان اور عمل سے حدود شکنی کبھی امن کی زندگی نہیں دے سکتے۔

اور یہی وہ راز تھا جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے رکھنا ضروری سمجھا۔ مگر ہمارا راوی چونکہ نکتہ رس دماغ نہ رکھتا تھا، اس لئے پیغمبر کی طرف کسی ایسے معنی کو منسوب نہ کرسکا، جو قرآن فہمی کے راستہ کو آسان کرسکتے۔ مطبوعہ یا مخطوطہ کتابوں میں روایت دیکھ کر ہی ایمان لے آنا کوئی ایسی قابل فخر و ناز چیز نہیں کہ اسے بے سوچے سمجھے ہی قبول کرلینا چاہئے۔ اگر میرے دوست ماہر صاحب یا ان کے کسی پس پردہ بزرگ نے اس روایت کی وزن و قیمت کا اندازہ لگا کر ہی اسے پیش کیا تھا تو دلائل کو بیان کرنا چاہئے، تاکہ اپنے دین و مذہب سے سچی محبت رکھنے والے عام تعلیمیافتہ فیصلہ کن طور پر سمجھ سکنے کے قابل ہوسکیں کہ ہمارے آپ کے درمیان جن پہلوؤں میں اختلاف ہے ان میں اصلاحی طور پر بھی کون زیادہ سچا ہے اور کون مذہبی جذبات کو مشتعل کرکے مذہب کو سیاسی انتخابات کیلئے موزوں بنا رہا ہے۔

چوتھی مثال یہ پیش کی گئی ہے:

وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونہن مما علمکم اللہ فکلوا مما امسکن علیکم واذکروا اسم اللہ علیہ

خدا کے سکھلانے کے مطابق تم نے جن شکاری کتوں کو سدھایا ہے، ان کے پکڑے ہوئے شکار کو تم کھا سکتے ہو، خدا کے نام سے ذبح کرکے۔

بہت صاف سیدھی آیت ہے، کہ اگر شکار مردہ نہ ہوگیا ہو اور ذبح کئے جانے کی قابلیت رکھتا ہو تو شکاری کتے کے شکار کو بھی کھا سکتے ہو۔ لیکن نکتہ چینیوں کے دل میں گرہ پڑ گئی اور وہ سوچنے لگے کہ اگر کتا اپنا شکار رکھا جائے تو اس کا پس خوردہ کھایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ حالانکہ ذبح ہونے کے قابل رہنے پر کھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اور زندہ ہونے کی صورت میں شکاری کتے کا اپنے شکار کو کھا لینا، شکار کے گوشت کو حرام نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن حدیث سے جواب مانگا گیا اور اس نے بقول ماہر القادری صاحب بتا دیا کہ

شکار حرام ہے اس لئے کہ کتے کا شکار کو کھانا اس کی دلیل ہے کہ اس کی تعلیم میں قصور ہے اور وہ اس انداز پر پورا سدھا ہوا نہیں ہے جس انداز پر شکاری کتے کو ہونا چاہیئے۔

یعنی حرام ہونے کی وجہ ذبح سے پہلے شکار کا مرجانا نہیں، بلکہ کتے کا پوری طرح سدھا ہوا نہ ہونا ہے۔ نہ معلوم ہمارے دوست کی سمجھ میں یہ فلسفہ کیونکر آگیا کہ خدا کے طے کردہ حلال و حرام کی بنیادیں اتنی غیر منطقی ہو سکتی ہیں۔ خدا کے نام لینے کی وجہ تو قدیم مشرکانہ رسومات کو مٹا کر موحدانہ رسومات کو نشوونما دینا ہو سکتا ہے۔ لیکن سدھانے کی کمی بیشی پاک و ناپاک کے درمیان کیونکر حدِ فاصل کھینچ سکتی تھی۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے بھی اپنے فٹ نوٹ میں بتا دیا تھا کہ فقہاء کی پنج گانہ شرائط میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو شکاری جانور کا مارا ہوا شکار حرام ہے۔

ہاں اگر مرا نہ ہو اور ذبح کر لیا جائے تو ما اکل السبع الا ما ذکیتم کے قاعدہ سے حلال ہوگا۔

علامہ موصوف نے ایک دوسری آیت سے سند پیدا کی۔ حالانکہ مذکورہ آیت ہی اپنا تصور مکمل طور پر پیش کر رہی تھی۔ بہرحال قرآن کی آیت میں کوئی ایسا ابہام نہ تھا، جسے دور کرنے کے لئے حدیث کا سہارا لینا پڑتا اور حدیث کو، کتے کو پوری طرح نہ سدھا سکنے کی سزا میں شکار کو حرام قرار دینے کی ضرورت محسوس ہوتی۔

یہ ہیں وہ مثالیں جن سے ماہر صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن سمجھنے کے لئے روایات کس طرح ناگزیر ہیں! میں نے انہی کی مثالوں کو واضح کیا ہے۔ ورنہ ہماری کتب احادیث میں قرآنی آیات کی تفسیر میں ایسی ایسی روایات بھی موجود ہیں جن کے پڑھنے سے آنکھیں زمین میں گڑ جائیں۔ لیکن میں ایسی روایات کے بیان کرنے سے اجتناب برتتا ہوں۔

باقی رہا پیغمبر اسلام کی سیرت یا ہنود و نصاریٰ یا دوسرے مذہبی مراسم کی تفصیلات سے متعلق روایات، ان کے لئے قرآنی تصور سے نہ ٹکرانے والی روایات یقیناً تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ اُن کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمارے پاس حدیث کا جو کچھ ذخیرہ ہے اگر قوم زندہ اور اس کا ذہن بیدار ہو تو اس ذخیرہ سے بھی زندگی کے صدہا سبق سیکھ سکتی ہے۔ اور یہی اندیہ

جناب پرویز پیش کر رہے ہیں۔ اور اس بیان کی تازہ تصنیف "معراجِ انسانیت" خود شاہد ہے۔ جو شخص حدیث کو تاریخِ دین کہہ کر یہ تسلیم کرتا ہو کہ

تاریخِ دین سے مراد یہ ہے کہ عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ میں قرآنی نظام کس طرح متشکل ہوا (طلوعِ اسلام نومبر)

آپ اسے تنقیدِ حدیث کی کیوں اجازت نہیں دیتے؟ پیغمبرِ اسلام کے نظامِ حیات کو نکھرے اور سنوارے ہوئے انداز میں پیش کرنے کی آرزو کو کیوں ٹھکراتے ہیں؟ دینِ اسلام جس زمانہ میں ایک ٹھوس واقعہ کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ اس دور کی سچائیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ جو عظیم شخصیتیں کسی پروگرام کو کامیاب بنا دیتی ہیں ان کے اقوال و افعال ہمیشہ قوموں کے لئے دلیلِ راہ بنتے رہے اور بنتے رہیں گے منصبِ نبوت کی عظمت کو محسوس کرنے والا پیغمبرِ اسلام کے فیصلے، طرزِ عمل اور طرزِ رہائش کا علم حاصل کرنے سے نفرت نہیں کر سکتا۔ ہاں اس احساسِ عظمت کے نتیجہ میں وہ لازمی طور پر مجبور ہوگا کہ ایسی باتوں کو پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف منسوب نہ ہونے دے جو پیغمبر کی شخصیت کو مجروح کر دیتی ہوں۔ اگر طلوعِ اسلام نے عظمتِ پیغمبر کو دوبالا کرنے والی احادیث کو بھی نفرت سے ٹھکرا دیا ہو تو آپ اختلاف کا حق رکھتے ہیں، ورنہ حدیث کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر فروغِ دین کی خدمت انجام دینے والے کو برا بھلا کہنا "ثوابِ دارین" کا باعث نہ ہو سکے گا۔

ذہنی انارکزم

ہمارے محترم دوست ماہر القادری صاحب نے ان حضرات کو "ذہنی انارکزم" کا طعنہ دینا پسند کیا ہے جو مشہور ترجموں سے ذرا ہٹ کر قرآنی مفہوم سمجھانا چاہتے ہوں۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ

این گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

آج کی فرصت میں اگرچہ اس موضوع پر کوئی طویل بحث نہیں چھیڑی جا سکتی، مگر مثال کے طور پر صرف ایک چیز پیش کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قرآن میں ایک جگہ کہا گیا تھا کہ

ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم

انھیں اس جنت میں داخل کیا جائے گا جس سے تعارف کرا دیا گیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں "عرفھا" کے صاف و روشن معنی کو الجھانے کے لئے "عرفھا" کے معنی "طیبھا لھم" (ان کے لئے خوشبوؤں سے مہکا دی گئی ہے) کر دیئے گئے۔ خوشبوؤں سے مہکانے کے ادبی تصور کو چونکہ عملاً بیان کرتے تھے اس لئے "ذہنی انارکزم" سے چشم پوشی کرتے ہوئے گذر گئے۔ ورنہ عربی لغت کا کوئی ماہر نہیں کہہ سکتا کہ "عرفھا" کے

معنیٰ طیبہانے کے جاسکتے تھے۔ لیکن اگرادبی تصور سے بھی بلند کسی علمی تصور کی بنیاد پر لغوی سند سے نسبت رکھنے والا ترجمہ بھی کسی نئے انداز میں کردیا جائے تو مذہبی فضاؤں میں یک لخت اندھیرا چھا جاتا ہے۔ قدامت پسندی اچھی سہی لیکن اسے مالیخولیا کی حد تک نہیں پہنچا دینا چاہیے۔

دوسری مثال سنئے ہمارے فاضل مخاطب نے "الم ترکیف" کے اصحابِ فیل کی مثال لے کر تمسخر پسند کیا ہے۔ شاید انھیں خبر نہیں کہ وہ ابابیل جنھوں نے آنجناب کے نزدیک اصحابِ فیل پر کنکریاں برسائی تھیں، خود شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے نزدیک بھی آپ کی فضاؤں میں پرواز کرنے والی ابابیل نہیں ہیں۔ بلکہ ابابیل کے معنی ہیں ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جانے کے۔ حضرت شیخ ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اور بھیجے ان پر اڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں

آج تک آپ کا خیال ہوگا کہ ابابیل کو گھونسلوں میں رہنے والا جانور یقین کرنا "ذہنی انارکزم" سے نفرت رکھنے کی دلیل ہو سکتا ہے لیکن شاید اب علامہ عبدہ مصری کے "ذہنی انارکزم" میں حضرت شیخ الہند کو بھی شریک کرنا پڑے گا۔ اور ابابیل کی بجائے مچھروں سے لیکر ٹڈیوں، چڑیوں وغیرہ تک ہر اس اڑنے والے کو ابابیل کہہ سکیں گے جو ٹکڑیوں میں اڑتا ہو۔

قرآن کے ساتھ اس کے تراجم کو بھی الہامی اور ابدی قانون کی طرح اٹل فرض کر لینا نہ معلوم ذہنی ارتقاء ہے یا دماغی انحطاط و پستی کی آخری حد۔ ادب کے کسی کا ترجمہ، تقدیر کا فیصلہ نہیں ہے۔ اگر قرآن کے تصور اور عربی لغت کا مطالبہ کسی ترجمہ کے خلاف ہو تو اس میں ہزار مرتبہ تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں۔ زندگی کے ہر گوشہ کو قلعہ بند نہ کر دیجئے، ورنہ زندگی کی پھیلی ہوئی فضاؤں میں پرواز کرنے کے تمام امکانات مٹ جائیں گے۔ اس پرواز کا انداز مختلف گوشوں میں نئے سے نئے حدود دریافت کرکے ان پر تنقیدی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ذہنی انارکزم جتنی بری چیز ہے، ذہنی غلامی اور محکومی بھی اس سے کچھ کم تباہ کن چیز نہیں ہے۔ دونوں پہلوؤں پر نگاہ رکھئے، ورنہ دو آنکھیں رکھنے سے کیا فائدہ؟

اب صرف دو عنوانوں پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ ایک حد تک تشنگی کو دور کیا جاسکے:

نظامِ صلوٰۃ | فاران میں صلوٰۃ کی جگہ نظامِ صلوٰۃ کی اصطلاح استعمال کرنے پر بہت زیادہ ناخوشگواری کا اظہار کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے مراسمِ عبادت کی ساخت کے اثر پذیر ہونے کا خوف تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک

له واضح رہے کہ ماہر صاحب نے اس مثال میں فریقِ مخالف میں سے کسی کا کوئی قول نقل نہیں فرمایا بلکہ اپنی طرف سے کچھ بے ترتیب سی باتیں لکھ کر کہا ہے کہ اس سورہ کی تفسیر میں یہ لوگ اس قسم کی باتیں کریں گے۔ علمی طبقہ میں یہ انداز تنقید کیا قیمت رکھتا ہے اسے اہلِ علم و نظر اچھی طرح جانتے ہیں۔ (ابوالنظر)

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنی الجھاؤ کو صاف طور پر سمجھ لیا جائے جواب کے نئے انداز کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔
آج ساری بین الاقوامی زندگی میں پوجا پاٹ کرنے اور مراسمِ عبودیت بجا لانے والی قوموں کی پستی، ذلت اور افلاس دیکھتے اور انسانی شعور و تجربہ کی رہنمائی قبول کرنے والی قوموں کو دولت و عزت کی بلندیوں پر پانے کی وجہ سے ہمارے نوجوان مجبور ہوتے جا رہے ہیں کہ اس عجیب صورتِ حال کا راز دریافت کریں۔

پکاروں ناخدا کو، یا خدا کو سفینہ تہ نشیں سا ہو چلا ہے

اس ہی لئے جناب پرویز نے مراسمِ پرستش کی ادائیگی کا فلسفہ ایک خاص انداز سے بیان کیا۔ "حدیثِ دیگراں" میں سننے کی بجائے خود ان ہی کی زبان سے سنئے تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ نظامِ صلوٰۃ کی اصطلاح ایجاد کرنے والا دل مسلم کو کافر بنانا چاہتا ہے یا دل کافر کو مسلم (ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۹ء صفحات ۳۳-۳۵)
اگر آپ کو نظامِ صلوٰۃ کی مذکورہ تشریح سے انسانی شعور، قرآن، حدیث یا کسی دوسرے سنجیدہ زاویہ نگاہ کی بنیاد پر اختلاف ہو اور آپ اس سے بہتر تصور پیش کر سکتے ہوں تو ضرور سامنے لائیے کوئی آپ کو روکنے کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن نماز کا فلسفہ بتانے کے قصور میں گردن زدنی بنا دینا مناسب نہیں۔ آج تو یہ حالت ہے کہ نماز کا فلسفہ بتانے سے بھی کام نہیں چل رہا کیونکہ عملی زندگی پرستش کے ٹھوس نتائج سے آشنا نہیں ہو سکی۔ بعد از مرگ زندگی کے علاوہ ہمارے پاس کوئی ایسا گوشہ حیات نہیں جہاں پرستش کا کوئی بھی معاشی فائدہ دکھایا جا سکے۔ اور بعد از مرگ زندگی کے نتائج کا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں۔ قرآن کہہ چکا کہ حصولِ جنت

لیس بأمانیکم ولا امانی اھل الکتاب

باغِ عیش نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق مل سکتا ہے، نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق۔

جس کارخانۂ حیات کی تمام طاقتوں کو صرف ایک مرکزی طاقت سے وابستہ کر کے شیطان کو طاقت سے محروم بتایا گیا تھا اگر وہیں خود مذہب پرستوں کے نزدیک شیطان کا غلبہ ہو گیا اور خدا کی ناقابلِ شکست طاقت کا یقین تاریخ کے معلوم سے نمودار نہ ہو سکا تو پھر نئی زندگی کے بارے میں ملتے جلتے دعووں کو ناقابلِ انکار کہنا نوجوانوں کو یقینِ محکم نہ دے سکیگا۔ مستقبل کے دھندلے خوف سے کسی قدر اثر قبول کر کے احتیاطاً کلمۂ شہادت پڑھتے رہنا اس زندگی کو واپس نہیں لا سکتا جسے پیغمبرانہ تاریخ میں آپ دیکھ چکے ہیں۔
بہرحال اگر آپ اسلامی جماعت کا سیاسی پہلو مضبوط کرنے کے لئے بھی ایسا کر رہے ہوں تب بھی جذباتی طوفان سے بلند ہو جانا ہی بہتر ہوگا۔ اگر آپ عوام کو وہ افیون دیتے رہے جس نے ان سے

اللھم اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

اے خدا ہمیں دنیا میں بھی خوشگوار زندگی دے اور آخرت میں بھی، اور دوزخ کی مشکلات سے بچا۔

جیسی بہترین دعا کی مقبولیت کو بھی چھین لیا ہے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ہنگامی طور پر اس کے سیاسی اور اقتصادی نتائج بہتر نکل آنے پر بھی اُسے "سیلابی" کرتے رہنا ملتِ مرحوم کے مستقبل کا تحفظ کر سکے گا۔

کائناتی حسن اور مذہب

مدیر فاران کو جناب پرویز سے شکایت ہے کہ انھوں نے دین کو کائنات کے حسن سے بہرہ یاب ہونے اور اس حسن میں نت نئے اضافے کرنے کی تعلیم دینے والا بنایا ہے۔ اس پرجس انداز سے اُن پر عتاب نازل کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہی ہے۔ اس باب میں صرف اتنا گذارش کرنا ضروری ہے کہ کاش "عیاشی" کا طعنہ دینے کی بجائے قرآن کی آیات سے ثابت کیا جاتا کہ دینِ الٰہی کائنات کے حسن سے پرہیز کرنے اور کائناتی حسن میں ہر اضافہ کو مٹانے آیا تھا۔ میں زہد پرست علما کو چیلنج دیتا ہوں کہ وہ قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت فراہم کریں۔ کائناتی حسن سے دلچسپی لینے کو عیاشی کے ہم معنی قرار دیدینا اور اس کے بعد وہ سب کچھ کہنے کی اجازت حاصل کر لینا جس کی اجازت سنجیدگی اور متانت کبھی نہیں دے سکتی، کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ جناب پرویز کی زندگی اور ان کا ماحول عیش پرستی سے کوئی دور کی بھی نسبت نہیں رکھتا، لیکن میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا عیش و آرام کی زندگی قرآن کی رو سے حرام ہے؟ (واضح رہے کہ عیش و آرام اور بدمعاشی کی زندگی میں زمین اور آسمان کا فرق ہے)۔ حضرت آدم کو شجرہ کے قریب جانے سے کیوں روکا گیا تھا؟ تاکہ عیشِ جاوداں سے محروم نہ ہونا پڑے۔ حضرت آدم نے کیوں حکم کی خلاف ورزی کی؟ اپنے عیش کو جاوداں بنانے کیلئے۔ خدا نے کیوں برابر اپنی رہنمائی سے انسانیت کو نوازا؟ صرف اس لئے کہ بنی نوعِ انسان جس عیشِ جاوداں سے محروم ہوگئی ہے اسے دوبارہ وہ ہی عیش نصیب ہو سکے۔ صحابہ کرام کا جان و مال کس چیز کے بدلے میں خریدا گیا تھا؟ عیش باغ کے بدلے۔ جہاں حور و قصور، نغمہ و شراب اور حسن و شباب کی ایک دنیا بسی ہوئی ہے۔ سرمایہ دارانہ عیش و سرمستی سے کیوں منع کیا گیا؟ کیونکہ اس سے طرح طرح کے تضاد پیدا ہو کر ٹکراتے اور عیش کو تباہی کے سانچہ میں ڈھال دیتے ہیں جس سے شعور بھی اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے، اخلاقی قدریں بھی مضمحل ہو جاتی ہیں اور مغلوبیت بھی بحران در بحران، جمود در جمود سے نجات نہیں پا سکتی۔ پوری کائنات اور اس کی تاریخی طاقتیں کیوں سرگرمِ عمل ہیں؟ انسانیت کو عیشِ جاوداں دے سکنے کے لئے۔ "بار بار عیش کوشی" کا طعنہ اس وقت دیا جا سکتا تھا جب سرمایہ دارانہ عیش و سرمستی کی طرف بلایا جا رہا ہوتا۔

ادب، موسیقی، آرٹ، زیبائش و آرائش کے شگفتہ اسباب میں سے کوئی چیز بھی بنیادی طور پر حرام ثابت نہیں کی جا سکتی۔

ہاں ان میں سے جس چیز پر بھی ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے گا، جس چیز کا رخ بھی تباہی کے غار کی طرف ہو جائیگا۔ جو بھی اخلاقی قدروں کو مٹانے، انسانی ذمہ داریوں کو فراموش، تمدنی حد بندیوں کو شکست اور تمدنی طبقات میں نفرت پیدا کر دینے کا باعث ہونے لگے، وہی چیز حرام ہو جائے گی، خواہ ادب ہو یا موسیقی[1]۔ علامہ پرویز کی ساری زندگی اس طرح کی عیش پرستیوں کے خلاف مسلسل جہاد میں گزری ہے۔ انھیں اس قسم کے عیش کا داعی کہنا اپنی جہالت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے۔

حق کا تقاضا اور اس کا یقینی معیار

اس کے بعد ایک اصولی چیز کی طرف آیئے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ حق کا تقاضا اور انسانی رجحان کا مطالبہ اپنی بنیادوں اور سمت کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ حق کے تقاضے کا کوئی ایسا یقینی معیار دریافت کیا جاتا جس سے انسانی رجحان کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا اندازہ ہو جائے۔ مگر بدقسمتی سے آج تک یہی چیز ہاتھ نہ آ سکی۔ سب سے بڑا یقینی معیار قرآن ہو سکتا تھا لیکن خود وہ ہی ظن و گمان سے سیرابی پر مجبور ہو گیا۔ انسانیت شاید اپنی مشکلات کا حل تلاش کرسکنے کیلئے اس کو بھی قبول کر لیتی۔ مگر بدقسمتی سے ظنیات کا مجموعہ بھی قرآن کے صدہا گوشوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ اس طرح نہ ہم قرآن ہی سے کوئی معیار حاصل کرسکے، نہ حدیث ہی اس تشنگی کو دور کرنے کے قابل بن سکی۔ عرب کا ہر بادیہ نشین شعوری ارتقاء سے ناآشنا ہونے کے باوجود "یسرنا القرآن" (ہم نے قرآن کو علم و عمل کے لحاظ سے سہل بنا دیا) پر بھروسہ رکھتے ہوئے صرف قرآنی آیات سے اپنے راستہ کی تاریکیاں دور کر لیتا تھا۔ لیکن براہ راست قرآن سے روشنی حاصل کرنے کی ممانعت کر دی جا چکی ہے اور حدیث اس خلاء کو پُر نہیں کر سکتی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ایک گم کردہ راہ مسافر کا ہوتا رہا ہے۔ صبح کا بھولا شام تک بھی گھر واپس نہ آ سکا۔

یقینی معیار قرآن ہو سکتا تھا، انسانی شعور و تجربہ ہو سکتا تھا، یا کائناتی قوانین اور تمدنی علوم ہو سکتے تھے۔ لیکن قرآن کو خود اپنا مطلب اپنی زبان سے ادا کرنے کے ناقابل سمجھ لیا گیا، حدیث کے ترجمان پوری بات نقل نہ کرسکے، عقل کو نکال باہر کر دیا گیا، کائناتی قوانین اور تمدنی علوم شیطانی ذریعہ علم ہو کر رہ گئے۔ ایسی حالت میں نجات کا راستہ تو کیا کھلتا ہاں عذاب کے پھاٹک کھلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ زندگی کے ہر گوشہ میں بے یقینی پھیل گئی۔ طبعی رجحان اور تقاضائے حق ملتی جلتی سچائی بن گیا۔ کوئی معیار نہیں جس سے قدامت پسندی اور جدت پسندی کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا جا سکے۔ اگر آپ ایمانداری کے ساتھ تقاضائے حق کا فیصلہ کن طور پر تعین کرنا چاہتے ہیں تو بتایئے کہ کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

---

[1] موسیقی وغیرہ کی حلت و حرمت پر علماء اور صوفیاء کی تصنیفات میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان دلائل کی جو نوعیت ہے، میں اس پر کوئی بحث و گفتگو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں خاص حدود ہی تک آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

قدیم طرزِ فکر تضاد رکھتی ہے اور جدید طرزِ فکر توبہ شکن۔ قرآن کی تفسیریں بھی ہم آہنگ نہیں۔ کریں تو کیا کریں؟ اگر قرآن پر نئے انداز سے سوچنا گناہ ہے تو پھر قدیم اندازِ فکر میں جتنی کمزوریاں، جتنی غلط کاریاں اور جتنا وسیع ترین خلاء ہے اُس کا نعم البدل کیونکر حاصل کیا جا سکے گا۔

قرآن اور اس کا اقتصادی زاویۂ نگاہ

کہنے کو تو آپ کے عظیم تر مفکر علامہ مودودی صاحب بھی قرآنی نظریۂ اقتصاد کو پیش کرنے کے دعوے دار ہیں مگر میں آپ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنی ساری عمر میں کسی ایسی تصنیف کا مطالعہ فرمایا ہو جس میں صدہا قرآنی آیات کی ترتیب سے خدا کی رہنمائی کا مرکزی نقطہ متعین کر دیا گیا تھا، تو خدا کے لئے اس کا نام ضرور بتا دیجئے تاکہ ہم "محکمات" کی روشنی میں "متشابہات" کی ٹھوکروں اور پیچیدگیوں سے نجات پا سکیں۔ لیکن اگر ایسی کوئی تصنیف نہ دکھائی جا سکے بلکہ اس کی جگہ ڈھائی فیصدی زکوٰۃ، قانونِ وراثت، انفرادی ملکیت اور خیرات و صدقات کا نام قرآن کا نظریۂ اقتصاد رکھنا پڑے، تو پھر آپ کو انسانی شعور سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ خدا کے بلند و ہمہ گیر شعور کی یہ نمائش دیکھ کر وہ سربسجود ہو سکے گا۔ آج کا موضوعِ بحث تفصیلات میں جانے کی اجازت نہیں دے رہا۔ لیکن اگر اس بحث کو چھیڑا گیا تو دلِ پُر اضطراب کی شورشِ پنہاں کو نمایاں کر سکوں گا۔

اطاعتِ رسول

مدیر فاران نے اطاعتِ رسول کا جو فلسفہ بیان فرمایا ہے وہ بڑا پر لطف فلسفہ ہے۔ میں فلسفہ کا ذوق رکھنے والوں سے مطالبہ کروں گا کہ علمِ کلام کی تاریخ میں اطاعتِ رسول کو قابلِ فہم بنا سکنے کی حد تک جو خلاء رہ گیا تھا اُسے ضرور پُر کر لیا جائے۔ مدیر محترم فرماتے ہیں کہ

> نہ خدا کو ہم دیکھتے ہیں اور نہ اس کی آواز سنتے ہیں تو پھر اللہ کی اطاعت آخر ممکن کس طرح ہے۔

شاید ہمارے دوست کا خیال ہے کہ خدا کو نہ دیکھنے اور آواز نہ سن سکنے کی کمی پیغمبر اسلام کے مشاہدہ اور آواز سے پوری کی جا سکتی ہے۔ یہ نکتہ حضرت موسیٰؑ کی قوم سے لے کر جس نے جہرۃً (کھلے طور پر) خدا کو دکھانے کا مطالبہ کیا تھا، امتِ محمدیہ کے کسی گروہ کی سمجھ میں بھی نہ آ سکا۔ ورنہ شاید قرآن کو بھی بار بار "لقاءِ رب" کا دعویٰ کرنا پڑتا۔ مولانا! خدا کی کمی پیغمبروں سے پوری کرنے کے ذہن ہی نے پیغمبروں کو ارباباً من دون اللہ بنا دیا تھا۔ ورنہ انسانیت قیامت تک بھی اس حماقت کا شکار نہ ہوتی۔ پیغمبر اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے نہیں بھیجے جاتے تھے بلکہ ان کی بعثت ایک ہی غایت رکھتی تھی یعنی وحی کے ذریعہ علم کی روشنی میں ان ٹھوس نتائج کو پیدا کر کے دکھانا جن کے لئے خدا کا قانونِ زندگی کام کر رہا ہے، اور جن میں کوئی انسانی جد و جہد تبدیلی نہیں کر سکتی۔ اگر پیغمبروں کا اتباع کرنے والے پیغمبر کی اطاعت نہ کرتے تو ٹھیک

وقت پر ٹھیک موڑ کا اندازہ کر کے اُن ٹھوس نتائج کو تاریخی سچائیوں میں تبدیل نہ کر سکتے تھے، جن کا وحی کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا تھا۔ عوام کو کیا خبر ہو سکتی تھی کہ حالات کا تقاضا کیا ہے؟ عبوری دور میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ اور تباہ کن انقلاب کے ہر موڑ پہ پالیسی میں کیا کیا تبدیلی کی جا سکتی ہے؟ آج جن پہلوؤں کو متعین کرنے کے لئے وزارت خارجہ وزارتِ داخلہ، وزارتِ مالیات، مرکزی اطلاعات کا محکمہ، جاسوسی کا محکمہ، ڈپلومیسی طے کرنے والوں کی کمیٹیاں، اور وزارتِ دفاع وغیرہ کی ذمہ داریاں پوری کرنے والے ادارے بنائے جاتے ہیں اور اربوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، ان سب ذمہ داریوں کو پچھلے دور میں تنہا ایک پیغمبر ہی پورا کرتا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ جب پیغمبر کی جماعت پیغمبر کی اطاعت نہ کرتی یہ انقلاب وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ معنی تھے اطاعتِ رسول کے۔ پیغمبروں پر یک لخت کوئی مطبوعہ کتاب نہیں اتاری جاتی تھی۔ بلکہ حالات و ضروریات کے مطابق رہنمائیوں کے مجموعہ کا نام ہی کتاب ہو جاتا تھا۔ قرآن کا یہ معجزہ سہی کہ وہ ہنگامی حالات سے بلند تر ہو کر نئے سے نئے حالات کی رہنمائی بھی کر سکتا ہے، لیکن جب تک نزولِ قرآن کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اور جب تک کہ لیظھرہ علی الدین کلہ کو عملی زندگی میں ثابت کر دینا باقی تھا، اس وقت تک اطاعتِ رسول کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ لیکن جب خدا کی رہنمائی ان تمام منازل سے گزر چکی تو آج اطاعتِ رسول کی اُس خاص ترکیبی ہیئت کو قبول کرنے کا کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ رسول کے بعد یہ اطاعت غیر متعین پہلوؤں میں اس مرکز کی ہوگی جو رسول کی جانشینی میں اس انقلاب کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی احادیث کو خود پیغمبر نے جمع کرانا پسند نہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ انسانیت کو اپنی آخری جدوجہد سے اس مقام پر کھڑا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے جبکہ وہ ٹھوکریں کھاتے اور سنبھلتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچ سکتی تھی۔ اس کے بعد تکمیل پذیرفتہ وحی پیغمبر کا اسوۂ حسنہ ملت کا نظامِ اجتماعی اور انسانی شعور کا ارتقاءِ مسلسل ہی شمعِ ہدایت بن سکتا تھا۔

یقین اور ظن خود مدیر فاران کو اقرار ہے کہ احادیث ظنی ہیں یقینی نہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ ارشاد فرماتے ہیں:

> مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ احادیث چونکہ "ظنی" ہیں اس لئے ان پر عمل نہ کرنا چاہئے ـــــ کیا اپنی زندگی میں ہم "یقینی" باتوں کے علاوہ "ظنی" باتوں پر عمل نہیں کرتے؟ ڈاکٹر دوا دیتا ہے اور ہم اسے ذرا بھی تامل کئے بغیر پی لیتے ہیں ـــــ حالانکہ ہم دوا کے بارے میں "یقینی" طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ سب کی سب صحیح ہیں، ہم موٹر، ریل اور ہوائی جہازوں میں بکھٹ سے سوار ہو جاتے ہیں، حالانکہ ہمیں ان کے کل پرزوں اور مشینوں کے بارے میں پورا یقین نہیں ہوتا کہ یہ بالکل ٹھیک حالت (Normal Condition) میں ہیں! ـــــ یہی

حالانکہ زندگی کے دوسرے معاملات میں ہے کہ "ظن" پر ہم عمل کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ "ظن" پر عمل کرنا عقل اور فطرت کے مخالف نہیں ہے اور "ظن" پر عمل کرنے سے اس زندگی میں سفر ممکن نہیں۔

ایک اہل دل بزرگ نے بڑی حکمت کی بات کہی کہ ماں کے بارے میں تو یقین کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقینی فلاں شخص کی ماں ہے، مگر باپ کے بارے میں اس یقین کے ساتھ حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے ماں کے وجود کا علم "یقینی" ہوا اور باپ کا "ظنی" ——— پس قرآن کو بلا تشبیہ ماں کے وجود کی طرح "یقینی" سمجھو اور احادیث کو باپ کے وجود کی مانند "ظنی" ——— بعض باتیں از قسم لطائف ہوتی ہیں مگر ان میں گہری حکمت پائی جاتی ہے۔ یہ بھی اسی طرح کا حکمت آمیز نکتہ ہے۔

شاید قرآن نے اپنے ذریعۂ علم کے "محدود" ہونے کی بنا پر کہا تھا کہ "ان الظن لا یغنی عن الحق شیئا" (ظن حق و صداقت سے بے پرواہ ہو جانے کا تھوڑا سا موقعہ بھی فراہم نہیں کر سکتا) کافروں کو بھی "ما یتبعون الا الظن" (کافر ظن ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں) کا طعنہ دینا بھی شاید "ناواقفیت" ہی کا نتیجہ ہوگا۔ اور "ان بعض الظن اثم" (بعض ظن گناہ بھی ہوتے ہیں) بھی شاید معلومات کی "کمی" ہو ورنہ کسی ایک آیت میں تو "ان بعض الظن خیر و احسن تاویلا" (بعض ظن بہتر اور اچھے نتائج کے حامل ہوتے ہیں) بھی کہہ دیا جاتا۔ یہ کیا قیامت ہے کہ قرآن انسانی کردار کی بنیاد، یقین و ظن میں سے صرف یقین پر قائم کرنا چاہتا ہے، اور آپ وحی کے یقینی ذریعۂ علم سے مایوس ہو کر ظن ہی کو اپنی عملی زندگی کا مرکزی نقطہ بنانا چاہتے ہیں! یہی نہیں بلکہ اگر حدیث کے ظنی علوم کو قرآن کے یقینی معیار پر پرکھنے کا مطالبہ کیا جائے تو آپ کا وہ سارا شرح صدر مٹ جاتا ہے جو براہ راست ظن پر اعتماد نے پیدا کیا تھا۔ آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ حدیث کے سارے ذخیرہ کو دفن کر دیجئے۔ صرف اتنی درخواست کی گئی ہے کہ ظن کی کسوٹی یقین کو بنا لیجئے۔ کسوٹی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا اور اسی سے وزن و قیمت کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ مگر آپ نہیں مانتے اور غصہ میں اپنے باپ پر بھی حملہ کر رہے ہیں۔ کیا آپ سنجیدگی سے کہہ سکتے ہیں کہ "اہل دل بزرگ" کے فریب گفتگو نے آپ کے اس یقین کو چھین لیا کہ آپ اپنے باپ ہی کی اولاد ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کا دل، کسی بزرگ کے مغالطہ سے بھی اس احمقانہ فیصلہ پر راضی نہیں ہوگا۔ زندگی کے مختلف گوشوں میں انسانی یقین کے وسائل مختلف ہوتے ہیں۔ تمدنی، تاریخی، شعوری، نفسیاتی، سائنٹفک وغیرہ صرف ذہنی امکانات کے پیش نظر ہم اپنے تمدنی یقین کو خیرباد نہیں کہہ سکتے، ورنہ اس غراق میں ترقی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اپنی والدہ کے یقین سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایک دایہ کے کہنے سے ماں کو ماں کہنا، قانونی شہادت کے نقطۂ نظر سے بھی گواہی کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ یا تو خود پیدا ہونے والے بچہ کا مشاہدہ ہونا چاہیئے، ورنہ چار گواہ پیدا کرنا ہوں گے۔ اور وہ بھی بہت ہی

پرہیزگار، اونچی سوسائٹی کے تاکہ جھوٹ کا اندیشہ نہ رہے۔ میں اپنے عزیز دوست سے عرض کروں گا کہ آپ "اہل دل" بزرگوں کے بہکانے میں نہ آئیے۔ یہ آپ کو ایسی راہ پر لے جا رہے ہیں جس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں اور جس کو اختیار کرنے سے خود آپ کی تمدنی پوزیشن پر بھی ناگوار اثر پڑے گا۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہر معاملہ میں ذاتی تحقیق نہ کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم زندگی کو ظن کے محور پر گردش دینا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہمیں کسی ڈاکٹر، ہوائی جہاز، انجن ڈرائیور پر یقین نہ ہو تو ہم شبہ پیدا ہوتے ہی سخت خطرہ محسوس کرنے لگیں گے، اور اپنے آپ کو ہر کسی مشتبہ جرکب یا ڈاکٹر وغیرہ کے سپرد کرنا پسند نہ کریں گے۔ یقین ہی عمل کی بنیاد ہو سکتا ہے۔ بے یقینی میں یہ طاقت ہی نہیں کہ انسانیت کے مستقبل کو خرید سکے۔ آپ ذاتی تحقیق اور ظن میں امتیاز نہ دے سکنے کی وجہ سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ ورنہ ایسی مثالیں نہ دیتے۔

انسانیت کو یقینی علم حاصل کر سکنے کے لئے چونکہ ہزاروں سال کی مسافت طے کرنا پڑتی تھی اس لئے قرآن نے انسانیت کا وقت بچانے کے لئے وحی کے ذریعہ وہی یقینی علم دیدیا جو معاشی زندگی کے ہر وقفہ پر علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین بنتا چلا جا رہا ہے۔ اگر آپ وحی کی وسعتوں، گہرائیوں اور بلندیوں کا اندازہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیں گے۔ تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یقین وہ نہیں ہوتا جو دآبہ یا ترس کے کہنے سے پیدا ہو۔ بلکہ وہ ہوتا ہے جسے تاریخ کا کوئی پلٹا، جدوجہد کی کوئی ساخت، بغاوت کا کوئی ہنگامہ اور زندگی کی کوئی سمت، کوئی موڑ جھٹلا نہ سکے۔ ایسی سچائیاں اپنے پورے خدوخال کے ساتھ قرآن ہی کے سپاروں میں مل سکتی ہیں۔ حدیث رنگ و غازہ کا کام کرسکتی ہے۔ مگر حسن فطرت کا شاہکار اپنی تمام تناسب آفریں رعنائیوں کے ساتھ قرآن ہی کے اوراق حیات پر دیکھا جا سکے گا۔

روایت پرستی اور ذہنی تضاد

یقینی ذریعۂ علم سے محروم ہو کر انسانیت کس حد تک روشنی و رہنمائی سے دور ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے آپ کو دور جانے کی ضرورت نہیں۔ خود مولانا مودودی صاحب نے "ملکیتِ زمین" کے مسئلہ پر اپنی تازہ تصنیف میں جو کچھ فرمایا ہے، اور ان ہی کے زیر سایہ پرورش پانیوالے مفکرین جو کچھ تحریر فرما چکے ہیں وہی اس چیز کی گواہی کے لئے کافی ہوگا کہ ظنیات مسائل کو سلجھانے کی کہانتک صلاحیت رکھتے ہیں۔ مولانا موصوف اپنی مذکورہ تصنیف میں "خود کاشت" کی تائید کرنے والی حدیثوں کو ٹھکراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں بیان کسی اور طرح ہو گیا۔

گویا کہ بزرگ ترین صحابہؓ سے روایت ہونے والی سچائیاں اگرچہ اپنی سند و شہادت کے لحاظ سے معتبر ہیں لیکن مولانا کے نزدیک پیغمبر اسلام کا جو مدعا تھا اسے قریبی زمانے سے گذرنے والے صحابۂ کرام تو درست طریقہ پر پیش نہ فرما سکے لیکن جماعت اسلامی کا

ڈکٹیٹر پیغمبرِ اسلام کے دل میں اتر کر وہ سچا موتی نکال لایا جس کے سچے ہونے کی دلیل اس کے سوا کوئی نہیں کہ وہ سچائی مولانا کے پاک دل کو القا کی گئی تھی۔ اگر شخصی شعور کو حق ہے کہ وہ معتبر سے معتبر روایات کو بھی اپنے زاویۂ نگاہ سے غلط کہہ سکے تو انسانی شعور کو شعوری ارتقاء یا قرآنی حقیقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تنقید کا کیوں حق نہیں دیا جا سکتا؟ انھیں تو تنقید کا حق نہیں دیا جاتا لیکن مولانا مودودی کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ کھلی ہوئی احادیث کا انکار کر دیں، ایسی احادیث کا جن کے بارے میں خود ان کی پارٹی ہی کا ایک فرد لکھ چکا ہے کہ

> جن احادیث کو مزارعت (بٹائی) کے عدم جواز کے لئے پیش کیا جاتا ہے وہ صرف اسی وجہ سے لائق ترجیح نہیں کہ وہ مرفوع ہیں، بلکہ اس لئے بھی وہ ترجیح و اختیار کی مستحق ہیں کہ وہ قرآنی اصولِ حکیمہ سے مطابقت رکھتی ہیں۔ قرآنی الفاظ میں زمین انسان کے لئے "متاع" ہے یعنی اس سے "تمتع" کیا جا سکتا ہے اور اس کا مالکِ حقیقی صرف خدا ہے اس لئے ایک شخص اتنی ہی زمین پر قابض رہ سکتا ہے جو اس کے تمتع کیلئے کافی ہو اور جتنی زمین اس مقصد سے زائد ہو گی وہ دوسرے کا حق ہے۔ (روزنامہ تسنیم ۱۹ ستمبر ۱۹۵۲ء بحوالہ آفاق حکیم حیدر زماں صاحب)

اور اس کے بعد جاگیرداری و سرمایہ داری کے جواز میں فتویٰ صادر فرما دیا۔ جو احادیث مولانا کے عزم کے راستے میں رکاوٹ ہو سکتی تھیں انھیں ٹھکرا دینے کے بعد اعلان کر دیا گیا۔

> جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔

گویا کہ مولانا کے نزدیک صحابۂ کرام سے روایت شدہ احادیث "جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت" کو بھی حرام قرار دے رہی تھیں۔ صحابۂ کرام حرام و حلال کے بارے میں بھی اپنے پیغمبر کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اگر یہی صبح و شام رہے تو صحابۂ کرام کی روایات پر بھروسہ رکھنے کی کیا صورت پیدا کی جا سکے گی؟ قرآن کو تو پہلے ہی ناقابلِ فہم اور مسائل حل کرنے کے ناقابل یقین کر لیا گیا تھا، حدیث بھی اپنے معنی کو صحیح طور پر ادا کرنے کے ناقابل ہو گئی۔ تو بتائیے کہ اب جائز و ناجائز ذرائع کا یقینی علم کیونکر حاصل کریں اور کیسے اُن قدرتی ڈگریوں، ان معاشرتی پیمانوں اور ان حدود اللہ کا پتہ چلایا جائے، جن کے "پروپیگنڈے" سے دنیائے اسلام کی فضائیں گونج رہی ہیں اور جن کے نام پر اسلام کو دینِ مکمل کا امتیاز دیا جا رہا ہے۔ کیا حدیث و قرآن کا منشا یہی تھا کہ کاشتکار و مزدور کو کم سے کم ضروریاتِ زندگی فراہم کر کے، تمام زمینی پیداوار کو چند سرمایہ دار تقسیم کرتے رہیں؟ جب کوئی حد و نہایت نہیں تو ایک سرمایہ دار ڈھائی فی صدی زکوٰۃ کے چند خزف ریزے پھینک کر کیوں غریبوں کی گردن پر سوار ہونے اور زندگی کے تمام اقتدار پر قابو یافتہ ہونے کی جد و جہد سے باز رہے؟ کاش وہ حضرات جنہوں نے قرآن کو اپنی راہ کا کانٹا اور حدیث کو شخصی خواہشات کے سانچے میں ڈھل جانے والی چیز سمجھ کر طعنہ زنی کا پیشہ اختیار کیا تھا

اس چیز سے ناآشنا ہونے کہ عام مسلمانوں کی ناواقفیت سے زیادہ عرصہ تک فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اس قسم کے گمزدہ آسرے کبھی زمانہ کے دھارے کا رخ نہیں بدل سکا کرتے؟

بہرحال میں چاہتا ہوں کہ مدیر فاران غور فرمائیں کہ جن روایات کے عشق میں وہ اہلِ قرآن کو دشنام طرازی کا نشانہ بنا رہے ہیں انہی روایات کو خود آپ کے مجتہد اعظم پیغمبرِ اسلام کے تصور کا آئینہ دار تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے انہی روایات پر اور زراعتی کشمکش کا اندازہ کرتے ہوئے مزارعت کو ناجائز قرار دیا تھا۔ اگر مرفوع احادیث کا بھی یہ حشر بنایا جا سکتا ہے تو دوسری احادیث کی بازار میں کیا قیمت رہے گی؟ پہلے ہی لاکھوں احادیث میں چند ہزار کا انتخاب کیا گیا تھا، اگر نئے "انتخاب" کی ضرورت پیش آ گئی تو شاید روایت پرستی کا جنازہ ہی اٹھ جائے گا۔

یہ کیا قیامت ہے کہ معارف القرآن اور معراج انسانیت کے مصنف کو اپنی حق پرستی کا نشانہ بنانے والے، مولانا مودودی کے طرزِ فکر سے ٹکرانے اور ان کی کمزوریاں نمایاں کرنے کی جرأت رندانہ سے محروم ہو چکے۔ اگر اربابِ اقتدار سے بھی خوف نہیں تو مولانا مودودی سے خوف کیوں ہو؟ جنت دجہنم کی کنجیاں نہ کسی مجدد کے پاس ہیں نہ امیرِ جماعت کے پاس۔ نجات آپ کی اور ہماری آرزوؤں پر گردش نہیں کر رہی۔ لہذا مجھے یہ امید کرنا چاہیئے کہ آپ کا بے باک قلم ذرا پیچھے مڑ کر بھی دیکھے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ایک غار سے نکل کر دوسرے اندھے کنوئیں میں گر پڑیں۔ اگر آپ کے پاس شمع ہدایت ہے تو خود بھی روشنی حاصل کیجئے اور دوسرے لوگوں کی رہنمائی کا بھی فرض ادا کیجئے۔ ورنہ اگر یک طرفہ ڈگری دی گئی تو حق پرستی مجروح ہو جائے گی —

فتنۂ پرویزی کے دائرۂ اثر کی وسعت و پہنائی کا اندازہ کرا سکنے کے لئے اگر ندوۃ المصنفین دہلی کے آرگن رسالہ برہان کا ایک اقتباس بھی پیش کر دیا جائے تو یارِ گناہ کو تقسیم کرنے کا موقعہ مل سکے گا؛

> پس اگر قرآنی آیت کے کسی ایک معنی کی تائید و تصدیق روایاتِ صحیحہ اور سنتِ رسول سے ہو جاتی ہے تو اس معنی کو ترجیح دی جائیگی اور باقی کو ترک کرنا پڑے گا۔ لیکن اخبار و روایات کے متعلق یہ بات ضرور ملحوظ رہے گی کہ ان کا درجہ باوجود صحیح ہونے کے ظنی ہے اور قرآن مجید قطعی ہے اور ظنی چیز کو قطعی چیز کے ساتھ ملا کر نتیجہ نکالا اگرچہ از روئے اصول ظنی ہے۔ مگر چونکہ روایت وحدیث کو اس آیت کے ساتھ ملانے سے اس آیت کے معنی و مطالب (الف) زبانِ عرب کے قواعد کے خلاف نہیں۔ (ب) ضروریاتِ دین اور اصولِ شریعت کے خلاف نہیں۔ (ج) بداہتِ عقل کے خلاف نہیں۔ اس لئے ان معانی کو ترجیح دینا ضروری ہو گا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا، کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ احادیث کے ذریعے تفسیر اس وقت تک اطمینان ویقین پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ قواعدِ عربیت، اصولِ شریعت اور انسانی شعور کے نزدیک وہ درخورِ اعتناء نہ ہو۔ کیا علامہ پرویز کا گناہ یہی

نہ تھا؛ اگر یہی تھا تو ——— ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اسی مضمون میں دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ

> قرآنی آیات کا مطلب قواعد عربیت اور اصول شریعت کے مطابق (بغیر ظنی روایات و اخبار کے ملائے) بیان کرنا صحیح تفسیر ہے اور یہی تفسیر بدون الرائے ہے۔ (مارچ ۱۹۵۴ء برہان۔ از خواجہ سید محمد علی شاہ اسحاقی)

کیا آپ ادارہ ندوۃ المصنفین پر بھی فرد قرارداد جرم عائد کرنا پسند فرماتے ہیں یا نہیں۔

حدیث کے بارے میں جو نظریہ علامہ پرویز کا ہے، اتفاق سے وہی زاویۂ نگاہ مولانا مودودی بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

> روایت کے باب میں محدثین کا مستند ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ جن امور کا تعلق عقل، درایت اور فہم و استنباط سے ہے ان میں بھی وہ بالکلیہ معتمد سمجھے جائیں۔ (ترجمان القرآن جلد ۱۰ عدد ۴ ۱۹۳۷ء)

کیا آپ نے غور فرمایا کہ جتنی احادیث بھی فہم و استنباط اور عقل و درایت سے وابستہ ہو سکتی ہیں ان کے بارے میں محدثین پر پورا بھروسہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنی عقل، اپنے طریقۂ استنباط اور اپنے مخصوص طرز حدیث فہمی سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ علامہ پرویز بھی احادیث سے سند لینے کو جرم نہیں خیال کرتے۔ معارف القرآن میں نہ معلوم کتنے گوشوں میں انھوں نے حدیث پیغمبر سے کام لیا ہے۔ ہاں وہ ہر توہم پرستانہ حدیث پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں۔ نہ صرف اتنا ہی ہے بلکہ توہم پرست ذہن کی نمائش کرنے والی احادیث کو نمایاں بھی کرتے رہتے ہیں تاکہ داعظان محراب و منبر اپنی قدیم روش کے مطابق عوام کو زندگی کی ٹھوس سچائیوں سے دور رکھ کر "بھول بھلیوں" میں گردش دے سکیں ——— شاید اسی قصور میں صاحب معارف القرآن کو جرم و گناہ سے آلودہ کیا جا رہا ہے، ورنہ جبکہ خود مولانا مودودی کے نزدیک بھی نہ صحابہ کی حدیث فہمی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے نہ محدثین کی فہم و خرد اور طریقۂ استنباط پر، تو پھر حدیث کے ذخیرہ میں وہ کونسا پہلو رہ گیا جسے یقینی دین کا جزو بنا کر ایمان و اطاعت کا مرکز بنایا جائے۔ خصوصاً جبکہ قیامت تک ہر شخص کو دوسرے کے طرز فہم سے انکار کا حق دیا جا رہا ہو جو کسی وقت بھی حدیث کے ظن کو یقین کا نمائندہ نہ بنا سکے گا ——— جو فتنہ "بارگاہ پرویزی" سے اٹھ رہا تھا اگر یہ فتنہ فرہاد بھی وہی "جوئے شیر" نکال رہا ہو تو جام و ساغر کی تبدیلیوں سے "آب حرام" کو حلال بنانے کی جرأت رندانہ نہیں کرنا چاہئے۔

آخیر میں بھی اپنے دوست ماہر صاحب سے اتنا عرض کروں گا کہ اگر آپ کو اتنی صلاحیت اور توفیق ارزاں نہیں ہوئی کہ آپ اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو خدا کے قانون سے وابستہ رکھ سکیں جو اس وابستگی کیلئے اپنے دل و دماغ کی تسکین کا تقاضا کرتے ہیں تو کم از کم اتنا تو کیجئے کہ جو اللہ کا بندہ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ اس فرض کو انجام دینا چاہتا ہے اس کی راہ میں کانٹے نہ بوئیے۔ بچہ جبکہ **

** غیرت اور پاسداری کی تعبیرات نے کس اعلیٰ درجہ کی ... [illegible]

نئی مطبوعات

شباب سے پہلے	۴—۸—۰
قیامت	۵—۰—۰
بے آبرو	۴—۸—۰
ہچکولے	۴—۰—۰
چوٹ	۳—۰—۰
ٹکر	۳—۸—۰
اور انسان مر گیا	۴—۰—۰
دیوار	۴—۰—۰
دلہن کی ڈائری	۲—۴—۰
حیات نبی	۱—۸—۰
ایک مہاجر	۴—۰—۰
جب خون بہہ رہا تھا	۳—۰—۰
سوشلزم اور اسلام	۲—۰—۰
آخری لمحات قائد اعظم	۲—۰—۰
آگ اور خون (عارف بٹالوی)	۴—۰—۰
اقبال اور قرآن	۴—۸—۰
دو آنسو	۴—۰—۰

معارف القرآن جلد اول - دوم - سوم - چہارم
عہ عہ عہ عہ

کتاب لمیٹڈ - رابسن روڈ - کراچی

کتاب لمیٹڈ

کی اولین پیشکش

دو آنسو

انسانوں کی سوسائٹی کی اصلاح اسلامی تہذیب و تمدن کے ماتحت کرنا ہمارا عین نصب العین ہے اسی نظریہ کے ماتحت جناب عارف بٹالوی نے اپنے اس معاشرتی ناول میں ان تاریک پہلوؤں پر تہذیب و شرافت کی روشنی ڈالی ہے۔ تہذیب کی تلخیوں کو دلچسپ ناول میں پیش کرکے نوجوان طبقہ کی تاریک ذہنیت کو اسلامی معاشرت کی روشنی کے قریب ترین لانے کی بہترین کاوش ہے۔ اسی زہر سے ملت کا ذہن بگڑا تھا اور یہی زہر ان کا تریاق ہے۔ اس کتاب کا گردپوش ابراہیم آرٹسٹ کا احسانمند ہے جسے آپ فریم کرنے کے لئے تڑپ اٹھیں گے۔

قیمت مجلد چار روپے

اگر آپ اس لمیٹڈ ادارہ کی شرکت پسند فرمائیں تو یہ آپ کے لئے بیحد منافع کا سودا ہوگا اس سے مفید تجارت اور کیا ہوگی۔ تفصیل کے لئے الگ خط لکھیں۔

کتاب لمیٹڈ - رابسن روڈ - کراچی

معراجِ انسانیت

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرتِ صاحبِ قرآن، علیہ التحیۃ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب ہونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبحِ بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔

قیمت، بیس روپے۔ محصول ڈاک اور پیکنگ اڑھائی روپیہ

ادارہ طلوعِ اسلام

رابسن روڈ۔ کراچی

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو۔ اور

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ خریدکردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا، مال ویسا ہی نکلا

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔
ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری کا سامان۔ ٹائلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا۔ ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے: سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی

اور پرچون کے لئے: الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیز ہم ہوزری کا نہایت اعلیٰ مال خود تیار کرتے ہیں۔

کوہِ نور نٹنگ ملز۔ کلیٹن روڈ۔ کراچی

ہماری صناعی کا مرکز ہے۔ نفاست اور پائیداری میں بہت کم ملز اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

نیاز آگیں۔۔ ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

طلوع اسلام

جون ۱۹۵۰

-۸۱-